ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

MAY - JUNE - 1989

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۴ ——— شمارہ نمبر ۵-۶

مئی، جون سنہ ۱۹۸۹ء

• مدیر مسئول ——— نور محمد فلاحی

• مرتب ——— ولی اللہ سعیدی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

• سالانہ زرِ تعاون .... ۴۰ روپے

• خصوصی تعاون .... ۱۰۰ روپے

• غیر ممالک سے .... ۲۰ امریکی ڈالر

• فی شمارہ .... ۴ روپے

• اس شمارہ کی قیمت .... ۶ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پریس، برائے جمال پریس، دہلی ...... کاتب، رفیق احمد، شاہ پور، کندھرا پور، اعظم گڑھ

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن ...... محمد اسمٰعیل فلاحی ۳

بحث و نظر

ایک اجتماعی جرم کی کہانی انیس احمد اعظمی ۹

سلام اس پر کہ ...... شمس پیرزادہ ۲۹

دینی مدارس کی روایات و نصاب کی خصوصیات پروفیسر محمد سلیم ۵۰

آزادیٔ نسواں عبد المجید ندوی ۴۵

ادبیات

اقبال ۔ امید و آس اور ...... محمد اسمٰعیل خان ۱۸

حرفِ دانش ڈاکٹر محمد سجاد ۴۳

ملی مسائل

دینی مدارس پہ کم سے کم جہت ...... (ایک مکتوب) ابو اللیث اصلاحی ندوی ۲۵

تجویز برائے دینی مدارس ۲۶

تعلیم و تعلم

زمخشری اور "کشاف" عبید اثری فلاحی ۴۵

شعر و نغمہ

غزل و نعت شفیع اللہ خان راز، عطا عابدی ۔ عبد الحفیظ ۳۳، ۳۴، ۴۴ ۔ ۷۷

نشریات انجمن

رپورٹ اجلاس شوریٰ انجمن طلبۂ قدیم جاوید اشرف فلاحی ۷۸

جامعہ کے لیل و نہار

نائب ناظم جامعہ ۔ استقبالیہ محمد اسمٰعیل فلاحی ۸۷

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن ......

تلوار کے وار، بندوق کی گولیاں، بموں کے دھماکے، اور معاشی ناکہ بندیاں کسی ملّت کے لئے اتنی زیادہ ضرر رساں اور خوفناک نہیں ہوتیں جتنی یہ بات ہوتی ہے کہ کوئی ایسی تکنیک اور حکمت عملی اختیار کی جائے کہ اس ملت کا رشتہ اس کے ماضی سے کٹ جائے، اس کو اپنے عقیدہ کا علم ہی نہ ہو اور وہ اپنے فلسفۂ دین اور نظام حیات سے بیگانہ و بے خبر ہو کر اپنے دینی تشخص سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دولت کی ریل پیل، سرکاری ملازمتیں، حکومتی مناصب اور اونچی اونچی ڈگریاں، کوئی بھی چیز ملّت کو ملی حیثیت سے باقی رکھنے کے لئے علم دین سے محرومی کا بدل نہیں بن سکتی۔

اس حقیقت پر ملتِ اسلامیہ کی گہری نظر تھی۔ نبیؐ نے پہلے ہی دن سے اس طرف توجہ دی۔ کفارِ مکّہ کا ظلم و استبداد بھی دارِ ارقم میں آپؐ کو دین کی تعلیم دینے سے باز نہ رکھ سکا۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد جہاں مسجد نبوی کی بنیاد پڑی وہیں درسگاہِ رسولؐ کا قیام بھی عمل میں آیا۔ علم دین سیکھنے سکھانے کی ترغیب اور اس سے غفلت و بے توجہی پر وعیدیں سنائی گئیں۔ بتایا گیا کہ بدوی منافقین کے کفر و نفاق میں پختہ ہونے کی وجہ دین سے ان کی عدم واقفیت ہے۔ حکم ہوا کہ ہر جگہ سے کچھ لوگ علم دین حاصل کرنے کے لئے نکلیں:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۔ (سورۃ التوبۃ ۱۲۲)

اسی کے پیش نظر مسلمان جہاں بھی گئے انھوں نے مسجد اور مدرسہ کی بنیاد ضرور رکھی۔ کبھی مسجد ہی مدرسہ کا کام دیتی اور کبھی مسجد کے ساتھ الگ سے مدرسہ کا قیام عمل میں آتا۔ کم ہی ایسے گاؤں آپ کو ملیں گے جہاں مسلمان آباد رہے ہوں اور انھوں نے مسجد اور مدرسہ کا انتظام نہ کیا ہو۔ یہ مدارس و مکاتب مسلمانوں میں زندگی کی حرارت پیدا کرتے اور اندرونی و بیرونی خطرات اور فتنوں سے ان کی حفاظت کرتے۔

۱۸۸۲ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر گلیڈ اسٹون نے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر دارالعوام کے ممبروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "جب تک یہ کتاب مصریوں کے پاس موجود رہے گی ہم ان کے علاقوں میں نہیں جم سکتے"۔ چنانچہ انگریز اس حقیقت سے شروع ہی سے خوب واقف تھے کہ مسلمانوں کی زندگی کا اصل راز قرآن ہے اور یہ مدارس مسلمانوں کے دینی قلعے ہیں، یہیں سے قرآن کی روشنی بکھرتی اور مسلمانوں میں برقی رو دوڑتی ہے۔ جب تک یہ قلعے مسمار نہیں ہوتے، مسلمانوں کا رشتہ اس کتاب سے نہیں کاٹا جا سکتا۔

اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد جہاں ۱۸۲۸ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے مدارس کے تمام اوقاف اور معافیاں بحق سرکار ضبط کرلیں اور ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ کا حکم سامنے آیا کہ عربی فارسی کے تعلیم یافتہ شخص کو سرکاری ملازمت نہیں دی جائے گی، وہیں ساتھ ہی انگریزی اسکولوں اور کالجوں کو ایک مخصوص مغربی لادینی نظام تعلیم کے ساتھ ایک پروگرام کے تحت پورے ملک میں پھیلانے کی کوشش کی گئی۔

علماء نے دیکھا کہ یہ تو ان کی دینی و تہذیبی موت کا سامان ہے۔ چنانچہ انھوں نے مکاتب و مدارس کی طرف اور زیادہ توجہ دی۔ یہی مدارس تھے جو فکری و تہذیبی جارحیت اور مغربی سیلاب کے آگے سپر اور مضبوط بند بنے رہے جنھوں نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب میں گم ہونے سے بہت حد تک محفوظ رکھا۔ یہی تھے جنھوں نے اسپین کی تاریخ ہندوستان میں دہرانے نہیں دی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو مسلمانوں کے حق میں ہندوستان کو اسپین بننے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

اسپین میں مسلمانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے بعد مسجدوں میں تالے ڈال دیے گئے اور ایک ایک مکتب اور مدرسہ کو ختم کیا گیا اور اس طرح مسلمانوں کی زندگی کے اس منبع ہی کو خشک کر دیا گیا لیکن اس پر جتنا بھی ہم اللہ کا شکر ادا کریں کم ہے کہ انگریز ہندوستان میں مکاتب کے جال کو اکھاڑ نہ سکے۔ وہ یہاں اس پوزیشن میں تھے ہی نہیں کہ مسجدوں میں تالے لگا سکتے اور مدارس کو بند کرا سکتے۔ بہرحال مدارس اپنا کام کرتے رہے۔

ان مدارس اور ان کے علماء و فضلاء ہی کو اس بات کا کریڈٹ بھی ملتا ہے کہ جنگ آزادی میں سب سے پہلا، سب سے اہم اور سب سے بڑا کردار انہی نے ادا کیا۔ انہی کا خون سب

سے پہلے بہا اور یہی تحریک آزادی کا ہراول دستہ بنے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کی تاریخ دیکھی جائے، ایک دو نہیں، سیکڑوں علماء نظر آئیں گے بلکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ۱۸۵۷ء ہی سے یہ فاقہ مست علماء ایک دن بھی نچلے نہیں بیٹھے۔ جزائر انڈمان و مالٹا کی جلاوطنی اور قید بامشقت ہو یا جلیانوالہ باغ کی سفاکی و بربریت، کہیں بھی یہ نورانی چہرے پیچھے نظر نہیں آتے۔

ان مدارس کا ایک امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ علم و اخلاق کی مشعل کو یہ مستقل روشن رکھے ہوئے ہیں، ملک سے جہالت و ناخواندگی دور کرنے اور بد اخلاقی و بے حیائی، و کرپشن کا قلع قمع کرنے کی اپنی بساط بھر کوشش کرتے ہیں لیکن حکومت پر کبھی بوجھ نہیں بنتے۔ اخلاص و للہیت، ایثار و توکل، صبر و رضا، محنت و کام کی لگن اور دینے کا جذبہ دیکھنا ہو تو ان مدارس دینیہ کو دیکھیے۔ وہ اپنی اس خدمت کا صلہ حکومت سے نہیں چاہتے کہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں بلکہ ان کی خودی و غیرت انھیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ حکومت کی کسی طرح کی امداد قبول کریں۔ اہل ملک اور ارباب حکومت کو ان بے غرض خاک نشینوں کا شکر گزار ہونا اور ان کی قدر کرنی چاہیے تھی کہ اس ملک میں جہاں سب لینے اور صرف اپنا حق وصول کرنا چاہتے ہیں، لینے بھی ایسے ہیں۔ بیشتر وہ بے غرض افراد اور ادارے یہاں موجود ہیں جو صرف خدمت کرنا جانتے ہیں۔ وہ کتنی ایمانداری، محنت اور جفاکشی کے ساتھ، صلہ سے بے پروا، قوت لایموت پر علم کی شمع جلائے جا رہے ہیں۔

لیکن اس کے بجائے مختلف سطحوں سے دینی مدارس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور ان میں مداخلت کی کوشش جاری رہی ہے جس کی انتہائی ظالمانہ مثال یو پی کے مدارس دینیہ پر کم سے کم اجرت قانون (MINIMUM WAGES ACT) کا نفاذ تھا۔ حالانکہ دیکھنا چاہیے تھا کہ یہ مدارس کوئی کارخانہ اور تجارتی ادارے نہیں ہیں۔ یہاں جو آتا ہے اخلاص، ایثار اور صبر و قناعت کے جذبے سے آتا ہے۔ اس قانون کے نفاذ کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کے تقریباً پندرہ ہزار مکاتب و مدارس حکومت کی طرف سے مقرر کردہ تنخواہیں نہ دینے کی صورت میں یا تو بند ہو جائیں یا پھر حکومت سے امداد لینے پر مجبور ہوں اور اس کے مطابق اساتذہ و ملازمین کو تنخواہیں دیں۔ اس طرح

حکومت کو مزید مداخلت کا موقع فراہم ہو جائے گا۔

اس معاملہ کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی سامنے آیا ہے کہ بعض مدارس کے کارکنوں اور ملازمین کی خواہش بلکہ مطالبہ رہا ہے کہ MINIMUM WAGES ACT کو مدارس دینیہ عربیہ تک وسیع کر دیا جائے۔ ایسے نادان دوستوں کے سامنے شاید صرف معاشی پہلو رہا ہے۔ انھوں نے اس سے آگے بڑھ کر دوسرے پہلوؤں پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی حالانکہ حکومت کی یہ امداد کس طرح ملتی ہے، حکومت کے امدادی (AIDED) مدارس کی خستہ حالت سے ظاہر ہے۔ مہینوں اساتذہ کو تنخواہیں نہیں ملتیں، پارٹی بازی اور مقدمہ بازی نے ان کی جڑیں ہلا دی ہیں۔ تعلیم و تربیت کا نظام مکمل طور پر مفلوج ہو چکا ہے۔ اگر وہ امدادی AIDED اور غیر امدادی UN AIDED مدارس کے طلبہ و اساتذہ کا موازنہ کرتے، دونوں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگاتے اور دونوں کے جذبہ ایثار و قربانی اور تقویٰ و خدا ترسی کا مشاہدہ کرتے تو انھیں خود نمایاں فرق محسوس ہوتا اور وہ پکار اٹھتے کہ

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ÷ ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

بہرکیف مدارس دینیہ پر کم سے کم اجرت کے قانون کا نفاذ ۱۹۴۷ء کے قبل سے آج تک کے رنگ دھنوں کے متعصب پسند فسادات سے زیادہ خطرناک، آئین ہند کی کھلی خلاف ورزی، ہندوستانی سیکولرزم پر حملہ اور جارحانہ فرقہ پرستی ہے۔ آئین ہند دوسروں کی طرح ہمیں بھی عقیدہ و عمل کی آزادی کے ساتھ اپنی زبان و تہذیب کی ترویج کی ضمانت دیتا ہے۔ ہمارے مدرسے اور مکاتب ہمارے عقیدہ و زبان اور تہذیب و ثقافت کی ترویج و اشاعت کا مظہر ہی تو ہیں، ہم انھیں بھوکے رہ کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر چلاتے ہیں۔

حکومت اترپردیش نے یکم جون ۱۹۸۹ء کے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعہ دسمبر ۱۹۸۲ء کے نوٹیفکیشن کو منسوخ کر دیا ہے جس کے تحت دینی مدارس کو کم سے کم اجرت کے قانون کو اور اقامتی درسگاہوں کو عورتوں اور بچوں کے اداروں سے متعلق کنٹرول ایکٹ (U.P. WOMEN & CHILDRENS INSTITUTIONS CONTROL ACT 1956) کے تحت لائسنس لینے کا پابند کیا گیا تھا۔ یہ ایک مستحسن قدم ہے لیکن کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ مستقل طور پر ایسی قانونی ترمیم کی جائے کہ کوئی سرپھرا افسر شاہی ذہن پھر سے کسی نوٹیفکیشن کا سہارا لے کر ان مدارس کی

زندگی سے کھیلنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اساتذہ اور دیگر کارکنانِ مدارس علم و دین کی خدمت، اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور ملک و ملت کی تعمیر میں اپنا حصہ، صبر و شکر، ایثار و قناعت، اور ایمان و احتساب اور مومنانہ حوصلے کے ساتھ ان شاء اللہ ادا کرتے رہیں گے۔ انھیں اس کی پروا نہیں ہوگی کہ بوریہ نشینی ملتی ہے یا خاک نشینی کہ یہی ان کی شانِ قلندری ماضی میں بھی رہی ہے اور اسی سے ان کا حال بھی روشن ہے اور مستقبل کی تابانی بھی اسی سے وابستہ ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی مدارس کے ذمہ داروں کو اس پہلو پر بھی سنجیدگی کے ساتھ اور ہمدردانہ طریقہ پر غور کرنا چاہیے کہ باعزت طریقہ سے وہ کیسے اپنے اساتذہ اور کارکنوں کی جائز اور بنیادی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں۔ گرانی کس تیزی سے بڑھ رہی ہے، ہر شخص پریشان ہے۔ ظاہر ہے وہ بھی انسان ہیں کوئی مافوق البشر ہستی نہیں کہ انھیں کسی چیز کا احساس نہ ہو۔ ان کے بھی بیوی بچے ہیں۔ والدین اور زیر کفالت بھائی بہن ہیں، انھیں بھی کھانا کپڑا اور رہنے کے لئے مکان چاہئے، بیمار ہوں تو اپنا اور اپنے بچوں کا علاج کرا سکیں۔ ایسا تو نہ ہو کہ بچوں کو بھوک سے بلکتا اور علاج نہ ہونے کی وجہ سے انھیں درد و تکلیف سے تڑپتا دیکھنا پڑے اور علالت کی صورت میں اپنی غیرت و خودی کو دبا کر، کفن کے لئے دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کا ننگ گوارا کرنا پڑے۔

کاغذ کی قیمت مسلسل بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے اس دوران دوسرے رسائل و مجلات کی قیمتوں میں بار بار اضافہ ہوا ہے ادھر ڈیڑھ ماہ میں اس کی قیمت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ مجلہ "حیات نو" کی قیمت بڑھائیں۔ ہم نے ممکن حد تک ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن حالات کے آگے ہمیں سپر ڈالنی پڑی۔ اور ہم مجبور ہوئے کہ اس کی قیمت میں اضافہ کا اعلان کریں۔ اب سے ایک شمارہ کی قیمت چار روپے اور سالانہ زرِ تعاون چالیس روپے ہوگا۔

"حیات نو" بازاری و سطحی قسم کا کوئی رسالہ نہیں ایک باوقار علمی، تحقیقی، مقصدی اور تحریکی مجلہ ہے۔ قارئین کرام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس طرح کے رسالے بالعموم خسارے میں چلتے ہیں۔ اس اضافہ کے بعد بھی خسارہ ہی میں چلے گا تاہم کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ ہم اپنے قارئین سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس اضافہ کو ہماری مجبوری خیال کریں گے۔ ••

بقیہ: سلام اس پر کہ........

جہاں تک کسی ایسی قابل اعتراض کتاب یا پرچہ پر قانونی پابندی عائد کرنے اور اس کو ضبط کرنے کا تعلق ہے ایک جمہوری ملک میں مسلمانوں کا مطالبہ بالکل بجا ہے اور فرقہ وارانہ اشتعال پیدا کرنے والی باتوں کو روکنے کے لیے جو قوانین بنائے گئے ہیں ان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ حکومت ایسی چیزوں کا فوراً نوٹس لے اور مجرم کے خلاف قانونی کارروائی کرے۔

ایسے موقع پر مسلمان جذباتی انداز میں کوئی تحریک چلانے کے بجائے سوچ سمجھ کر ضروری کارروائی کرنے کا فیصلہ کرلیں، اور مسلم مجلس مشاورت یا ذمہ دار حضرات پر مشتمل کوئی اجتماع بروقت حکام سے ربط کرے اور ضروری اقدامات کے لیے حکومت پر اثر ڈالنے کی کوشش کرے تو اس قسم کے فتنوں سے نمٹنے کی بہتر صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام دعوت اسلامی کو باشندگان ملک کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا صحیح تعارف اور آپ کی سیرت کو نمایاں کرنا ضروری ہے۔ نیز ان شبہات کا ازالہ بھی جو اسلام اور ہمارے پیغمبر کے بارے میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر مسلمان مثبت طور سے اس کام پر کوششوں کو مرکوز کر دیں اور ہر ایسے موقع پر جبکہ مخالفین نے شر اور فتنہ کو برپا کرنے کا سامان کیا ہو مسلمان برائی کو بھلائی سے دور کرنے کی کوشش کریں اور اعتراضات کا اس انداز سے جواب دیں کہ دین کی حقیقت نکھر کر سامنے آئے اور رسول کی عظمت نمایاں ہو تو خیر ابھر سکتا ہے اور یہ بہت بڑا فائدہ ہو گا جو دین ملت اور انسانیت کو پہنچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ••

انیس احمد اعظمی

ایک اجتماعی جرم کی کہانی

جو خرابیاں ہمارے معاشرے کو تباہ کئے جا رہی ہیں اور جن کے باعث ہماری پستی، ہماری اپنی خود فریبیوں کے باوجود انتہا کو پہنچ چکی ہے ان میں نمایاں خرابی ہماری وہ خود ساختہ رسوم و رواج ہیں جن پر بے دریغ دولت ضائع کی جا رہی ہے خصوصاً شادی بیاہ کی رسوم اور اس کی تقریبات، جن پر غالباً سب سے زیادہ روپیہ صرف ہو رہا ہے۔

نکاح ایک مذہبی فریضہ ہے، اسے اگر سادگی و وقار، اعتدال اور کفایت شعاری سے مسنون طور پر انجام دیا جائے تو موجودہ گرانی کے دور میں بھی اس پر زیادہ رقم صرف نہیں ہو سکتی لیکن موجودہ دور کی شادی، اس کی رسمیں اور تقریبات، اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ اب اس کے لوازم میں قیمتی ملبوسات کے ڈھیر، ہزاروں روپے کے زیورات، سامان آرائش و نمائش کے انبار، گراں قیمت فرنیچر، ریڈیو، ٹیلیویژن، درجنوں بستر اور ان کی چادریں، قالین، قیمتی کراکری، کاروں اور بسوں کے ذریعے بارات کا جلوس، شامیانے، روشنی اور بجلی کے انتظامات، انواع و اقسام کے کھانے، سیکڑوں آدمیوں کے لئے مشروبات، دور دراز کے عزیزوں اور دوستوں کی بالاہتمام شرکت، مطبوعہ و مرصع دعوت نامے، منگنی، نکاح، دعوتیں، اور رخصتی، غرض برسوں کے اہتمام، فکرمندی، سامانوں کی فراہمی، بہت سے افراد کی دوڑ دھوپ، سعی و کوشش، شب و روز کی تھکن، صبح و شام کی پریشانیاں، بے شمار راتوں کی بے خوابیاں، اور سالہا سال کی کمائی اور وقت کے ہزاروں لاکھوں روپے صرف کر کے یا برباد کر کے ایک شادی انجام پاتی ہے۔

تضادات کا معاشرہ

موجودہ دور کی شادیوں کے یہ وہ لوازم ہیں جن کی پابندی فرائض سے بڑھ کر جاتی ہے اور جن سے انحراف ممکن نہیں۔ کاش! ہم مسلمان، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرائض اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کی

تعمیل کے اہتمام میں اس قدر اخلاص اور فکرمندی کا مظاہرہ کرتے، شوق و جذبے سے نماز قائم کرتے، زکوٰۃ ادا کرتے، دین کا علم حاصل کرتے، اس کی تعلیمات سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتے، اسی لگن اور انہماک سے نیکی و سعادت کے ان کاموں میں لگ جاتے جن کی خدا و رسولؐ کی نگاہ میں قدر و قیمت ہے اور جو دنیا و آخرت دونوں میں ہماری فوز و فلاح کے ضامن ہیں۔

کاش ہم شادیوں کی تقریبات اور لایعنی رسوم پر صرف کی جانے والی دولت کا عشر عشیر بھی دین کی اشاعت و تبلیغ، رفاہ عامہ کے کاموں، بچوں، عورتوں اور ان پڑھوں کی تعلیم اور اخلاق آموزی پر لگاتے یا صحتِ انسانی کا معیار بلند کرنے پر صرف کرتے تو ہماری موجودہ معاشرت میں بدبختی، شقاوت، افلاس اور ناداری، جہل اور غلاظت، بے رحمی اور حیوانیت کے وہ خوفناک اور کریہہ و بدنما مناظر ہرگز پیش نہ کرتی جن کا مشاہدہ بڑے بڑے شہروں سے لے کر دور افتادہ دیہاتوں تک یکساں کیا جا سکتا ہے۔

کیسی عجیب اور دردانگیز صورت حال ہے کہ معمولی سے گاؤں یا محلے میں شادیوں پر صرف ہونے والی دولت ہزاروں لاکھوں روپے تک پہنچتی ہے لیکن دوسری طرف پورے گاؤں یا محلے میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے قاعدے کا ایک مکتب اور مدرسہ موجود نہیں جو انھیں لکھنا پڑھنا سکھا دے، نماز کی دعائیں یاد کرا دے اور دین کے ابتدائی احکام سے روشناس کرا دے۔ ملک میں بے شمار دیہات ایسے ہیں کہ وہاں آزادی کے بعد چالیس برس گزر جانے کے باوجود ایک عورت بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔ پورے گاؤں میں ایک بھی ڈسپنسری یا دواخانہ موجود نہیں جس سے کسی مریض کو ابتدائی طبی امداد مل سکے۔ صحت و صفائی کے نقطۂ نظر سے صورت حال اور بھی مایوس کن ہے۔ مکانوں کے قریب گندگی کے ڈھیر، مکھیوں اور مچھروں کی کثرت اور غلیظ گلیاں اور نالیاں عام ہیں لیکن ناممکن ہے کہ کہیں آپ کو پھولوں کی کوئی کیاری، کوئی تختۂ چمن یا بچوں کے لئے پارک نظر آ جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی ساری دولت رسم و رواج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینے کے لئے ہے؟ اور کیا ہماری آرزوؤں اور تمناؤں کی معراج نمود و نمائش اور ظاہرداری کے سوا کچھ نہیں ہے؟ اور کیا ہم لوگ بحیثیتِ مجموعی عقلِ سلیم، فہم و فراست اور شعور و معقولیت سے

یکسر بیگانہ ہو چکے ہیں؟ جاہلوں کی بدعقلی کا ماتم کیا کیا جائے جنھیں ہم تعلیم یافتہ اور خواص کے زمرے میں شمار کرتے ہیں، رسم و رواج کے معاملے میں وہ بھی کم و بیش وہی کچھ کر رہے ہیں جو غیر تعلیم یافتہ اور شعور سے محروم کر رہے ہیں۔ بے عقلی، عاقبت نااندیشی اور نمود و نمائش میں کوئی کسی سے کم نظر نہیں آتا۔ یہ بیماری اس درجہ بڑھ چکی ہے کہ یہ چیز اب مقابلے اور مسابقے کا موضوع بن گئی ہے۔ بے شمار گھرانے جہیز کے سامان اور شادیوں کے اخراجات کے لئے روپیہ جمع کرنے کی دھن میں دنیا و آخرت کو فراموش کر چکے ہیں جن کو کئی کئی رشتوں سے سبکدوش ہونا ہے ان پر یہ فکر ایک بلا کی طرح مسلط ہے اور ان کے ذہن کا بڑا بوجھ اور روح کا دردناک عذاب بن گئی ہے۔ شادی کے لئے روپے کی فراہمی کا سوال اس قدر اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ بہتوں کے نزدیک اس کے لئے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ انہی رسوم کو بہانہ بنا کر رشوت، خیانت، سودی قرض، اقربا و اعزہ کی حق تلفی غرض بہت کچھ روا رکھا جا رہا ہے۔

مادیت کا غلبہ

مادیت کا غلبہ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ شادیوں میں باقاعدہ سودے بازی اور لین دین ہوتا ہے۔ کوئی اسکوٹر کا مطالبہ کرتا ہے اور کسی کو کار چاہئے کوئی نقد رقم کا خواستگار ہے، کسی کو تجارت یا اعلیٰ تعلیم کے لئے روپیہ درکار ہے۔ لوگ جبراً قہراً ان مطالبوں کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔ زندگی بھر کا اندوختہ اسی کام پر لگایا جا رہا ہے، قرض کی نوبت آ رہی ہے، کوئی جائیداد رہن رکھ رہا ہے، کوئی سودی قرض کے جال میں اپنی گردن پھنسا رہا ہے خواہ کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے یہ مطالبات تو پورے کرنے ہوں گے ورنہ شادی نہ ہو سکے گی۔ اور اگر ہو بھی جائے تو غریب لڑکی زندگی بھر سسرال والوں کے دل خراش طعنے سنتی رہے گی کہ تمہارے والدین نے دیا ہی کیا ہے؟ اس خود غرضانہ اور دل آزار ذہنیت کے ردِعمل کے طور پر بعض لڑکیاں خودکشی تک کر ڈالتی ہیں اور اگر یہ نہیں تو لڑائی جھگڑوں کے بعد طلاق تک تو نوبت پہنچ کر رہتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ لوگ قرآن و حدیث کے واضح احکام سے صرفِ نظر کئے ہوئے ہیں۔

انتباہ جسے نظر انداز کر دیا گیا ہے

اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا ہے، "اور آپ ان میں بہت سے ایسے آدمی دیکھتے ہیں جو دوڑ دوڑ کر گناہ (ظلم) اور حرام کھانے پر گرتے ہیں۔ واقعی ان کے یہ کام برے ہیں" (مائدہ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

"ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن بہت سی ظلمتوں کا باعث ہوگا۔ اور حرص سے بچو کیونکہ حرص نے ہی پہلی امتوں کو ہلاک کیا۔ حرص نے انھیں خون بہانے اور محارم کو حلال سمجھنے پر برانگیختہ کیا۔" (مسلم)

ایک اور حدیث میں ہے:

"جس نے کسی ایماندار کو ضرر پہنچایا اللہ تعالیٰ اس کو ضرر پہنچائے گا اور جس نے کسی ایماندار کو مشقت میں ڈالا اللہ تعالیٰ اس کو مشقت میں ڈالے گا۔" (ترمذی)

کیا اب یہی حالت ہمارے معاشرے کی نہیں ہو رہی ہے؟ مندرجہ بالا ارشادات کی روشنی میں بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری شادیوں میں حرص و طمع اور ظلم و جور کا عمل دخل کس قدر بڑھ گیا ہے جو بہت بڑا سبب ہے معاشرتی فساد، بے برکتی اور آپس کے جھگڑوں کا۔

آج مسلم گھرانوں کی کتنی ہی بیٹیاں تصویرِ انتظار بنی بیٹھی ہیں۔ معاشرے کی فاسد ذہنیت نے ان کے رشتوں کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ فکر مندیوں اور پریشانیوں نے ان کے والدین کی کمر توڑ دی ہے یا انھیں قبر تک پہنچا دیا ہے۔ اسلام کی ان بیٹیوں کے لئے کوئی صبح امید نہیں۔ ان کے مقدر کی شام الم میں کوئی چراغ روشن نہیں ہو سکتا۔

لیکن انہی گلیوں، محلوں اور گاؤں میں وہ گھرانے بھی ہیں جہاں دھوم دھام سے شادیاں ہوتی ہیں، بلند و بالا شامیانے، قمقمے اور روشنیاں، زرق برق لباس، بجتی ہوئی شہنائیاں، موٹروں کا ہجوم، لوگوں کی آمد و رفت، دعوتیں اور کھانے، غرض ایک جشن طرب اور محفل عیش و نشاط کا بھرپور منظر، معاشرے میں کتنا تضاد ہے اور کس قدر تفاوت۔ معاشرہ کس طور پر منقسم ہو چکا ہے۔ یہ خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ غربت اور امارت، بلندی اور پستی ——— ایک ریا کار اور برخود غلط سوسائٹی جس نے تمام اقدار کو تہ و بالا کر دیا ہے، ہم نشیب و فراز کے

جلو میں اضطراب، تصادم اور اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کے خطرات بھی ہیں۔ تاریخ فاسد معاشروں کی تباہی و بربادی کی عبرت انگیز داستانوں سے بھری پڑی ہے۔

ہمارے انحطاط و زوال کی داستان اگرچہ نہایت غم انگیز اور عبرت ناک ہے جس کے متعدد سیاسی، اقتصادی، اخلاقی اور تمدنی عوامل ہیں لیکن صرف مروجہ رسوم اور خود ساختہ رواجوں کے باعث جس طرح ہمارے مالی وسائل مسلسل تباہ و برباد ہو رہے ہیں ان کا ہم نے کبھی اجتماعی جائزہ نہیں لیا اور نہ کبھی یہ حساب لگایا کہ ان رسوم و رواج پر ملتِ اسلامیہ کا کروڑوں اربوں روپیہ کس آسانی سے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ آکاس بیل کی طرح یہ رسمیں شجر ملت کی توانائیوں اور شادابیوں کا رس چوس چوس کر اسے کس طرح کھوکھلا اور بے جان کئے دے رہی ہیں۔ کاش ہم سمجھ سکتے کہ خود اپنے ہی ہاتھوں ہم کس بے دردی اور عاقبت نا اندیشی سے اپنے وسائل لٹا رہے ہیں اور یہ کہ ہماری خاندانی زندگیوں کی بے شمار ناخوشگواریوں اور مشکلات میں ان رسوم کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ ـــ

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روزِ سیاہ
خود دکھایا ہے مرے گھر کے چراغاں نے مجھے

میرے علم میں بہت سے شریف خاندان ایسے ہیں جن پر برسوں سے شادیوں کا قرض لدا ہوا ہے اور وہ کوشش کے باوجود اس کے بار سے اپنی گردن نہیں چھڑا سکے حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤں میں اکثر قرض سے پناہ مانگی ہے۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ:

"خبردار! قرض سے بچے رہنا۔ قرض رات کا اندوہ اور دن کی خواری ہے۔"

ایک اور مقام پر آپؐ نے دعا فرمائی کہ: "میں کفر اور قرض سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔"

ایک اور دعا میں حضورؐ کا ارشاد ہے: "اے اللہ! میں قرض کے بوجھ، دشمن کے غلبہ اور دشمنوں کی ہنسی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا: "شہید فی سبیل اللہ کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے لیکن قرض معاف نہیں ہوگا۔" حدیث کی کتابوں میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم مقروض مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنے سے احتراز فرماتے تھے ——— اب ہم خود فیصلہ

کر سکتے ہیں کہ جن رسوم و رواج کے سبب ہم کو قرض لینا پڑتا ہے وہ ہمارے لیے کس قدر مصیبت، ذلت اور معصیت کا موجب ہیں۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ شادیوں کے اسراف اور فضول خرچیوں نے کتنی خاندانی راحتوں کا خون نہیں کر ڈالا ہے۔

احساسِ محرومی میں مبتلا کرنے کا جرم

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسراف اور تبذیر دونوں سے منع فرمایا ہے۔ اسراف نام ہے فضول خرچی اور مال کو بے احتیاطی سے خرچ کرنے کا جبکہ تبذیر دولت کو ناجائز، غلط اور ناروا کاموں میں اڑانے اور برباد کرنے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" دوسری جگہ ارشاد ہے:

"بلاشبہ ناجائز کاموں میں مال و دولت اڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں۔"

غور فرمایئے کہ شادیوں میں ساز و سامان کی غیر ضروری خریداری، انواع و اقسام کے کھانوں کی تیاری، لمبے چوڑے اہتمام و انتظام کیا اسراف کے حکم میں نہیں آتے۔ اور کیا شادیوں میں ناچ گانا، ریکارڈنگ، آتش بازی، لہو و لعب پر روپیہ اڑانا تبذیر نہیں ہے؟ یقیناً یہی کچھ تبذیر و اسراف ہے۔ لیکن ہم نے اپنی معاشرتی زندگی میں احکامِ الٰہی کو یکسر پس پشت ڈال رکھا ہے اور رسم و رواج کے نام پر وہ چیزیں اختیار کر لی ہیں جو قرآن و حدیث سے صریحاً متصادم ہیں۔

اگر آپ لوگوں کو سمجھائیں کہ شادی بیاہ پر زیادہ خرافات نہیں کرنے چاہئیں تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ جو لوگ غریب اور کم وسیلہ ہیں وہ بے شک خرچ نہ کریں، لیکن جنہیں اللہ نے خوشحالی و وسعت دی ہے وہ اگر خرچ کرتے ہیں تو کیا مضائقہ ہے، لیکن غور کیا جائے تو یہی طرزِ فکر اس معاشرتی فساد کے دروازے کھولے ہوئے ہے۔ سوال یہ ہے کہ شادی بیاہ کی آڑ میں نمود و نمائش کے ذریعے دوسروں کو ان کے کمتر ہونے کا احساس دلانا اور ان میں احساسِ محرومی پیدا کرنا کوئی معمولی جرم ہے؟

صاحبِ حیثیت اور متمول افراد تو دل کے حوصلے نکال لیتے ہیں اور یوں معاشرے میں اپنا "بھرم" قائم رکھتے ہیں لیکن غریب اور کم وسیلہ رکھنے والے افراد ان کی تقلید و پیروی کی پاداش میں قرضوں کے جال میں پھنستے ہیں یا پھر انھیں نامعقول آدمیوں کی انگشت نمائی کا ہدف بننا پڑتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انھیں جو سزا ملتی ہے اس کی بنیاد رکھنے والے معاشرے کے صاحبِ ثروت افراد ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے عرصۂ دراز سے اسلامی زندگی کے تقاضوں اور بہتر انسانی مقاصد کو فراموش کر رکھا ہے۔ کیا یہ امرِ واقعہ نہیں کہ معاشرے کی ظاہری خوشحالی کے ساتھ ساتھ بے شمار مسلمان پریشان حال، مفلس اور نادار ہیں۔ ان کی مفلسی اور ناداری اس درجہ کی ہے کہ اگر وہ بیمار پڑ جائیں تو علاج نہیں کرا سکتے، وہ اگر صحت بخش غذا چاہیں تو انھیں نہیں مل سکتی۔ وہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلانا چاہیں تو نہیں دلا سکتے۔ مناسب لباس میسر نہیں، جس معاشرے میں دس بیس نہیں ہزاروں لاکھوں انسان اس طرح کے ہوں اس میں لوگوں کا جھوٹی عزت، ظاہر داری اور خود ساختہ رسم و رواج پر اجتماعی انداز سے بے اندازہ دولت خرچ کیے جانا اور اسے ایک لازمہ قرار دے لینا قومی بے حسی کی دلیل ہے جس کی سزا سے کوئی قوم نہیں بچ سکتی ہے۔ ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

قرآن و حدیث میں صدقہ و خیرات، کارِ خیر، فروغِ دین اور اجتماعی فلاح و بہبود پر دولت صرف کرنے کی بہت زیادہ تلقین کی گئی ہے لیکن ہماری دولت صرف ہو رہی ہے، رسوم و رواج، نمود و نمائش اور اسراف و تبذیر پر۔ قومی اور اجتماعی حیثیت سے ہم حقیقی صدقہ و خیرات، انسانی خدمت کے خاموش پائدار کام، اجتماعی بہبود اور تحقیق و ایجاد پر روپیہ صرف کرنے کا کوئی میلان ہی نہیں رکھتے اور اگر کبھی کوئی میلان پیدا بھی ہو تو فضول رسموں اور پرشکوہ دعوتوں نے ہمیں اس قابل ہی کہاں چھوڑا ہے کہ غریب عزیزوں کی خدمت کر سکیں اور نیکی اور سعادت کے وہ کام کر سکیں جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی، آخرت سنورتی اور انسانیت کو فلاح و آسودگی نصیب ہوتی ہے۔

جس دولت کو انفرادی اور اجتماعی طور پر عزیزوں، بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کی حاجت برآریوں پر صرف ہونا چاہئے تھا، جس کو دین کی تبلیغ و اشاعت، رفاہِ عام کے کاموں اور مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت اور ہنرمندی پر لگایا جانا چاہئے تھا اور جس سے تعمیرِ ملت اور نفع بخشیِ خلق کے بیسیوں کام لئے جا سکتے تھے وہ غیر شعوری طور پر ہمارے جھوٹے جذبۂ نمود و نمائش، لہو و لعب اور ریاکاری پر ضائع ہو رہا ہے اور اس نقصان کا ہمیں مطلق شعور و احساس نہیں، ہماری ذہنی کج روی نے رسوم و رواج اور بدعتوں کو

ور اس درجہ بے حسی کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ کاش ہمارے اندر احساس کی ایسی اجتماعی لہر اٹھے جو ہم کو اپنی پوری معاشرتی زندگی کا جائزہ لینے اور اس کی اصلاح پر مجبور کر دے اور ہم ہر غیر ضروری اور مضر فکر کو اس سے خارج کرنے پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ یہی چیز ہم کو اسلامی تعلیمات اور اس کے اخلاقی نصب العین سے قریب کر سکتی ہے۔

خیر و برکت کس طرز عمل میں ہے

رسوم و رواج کی ان زنجیروں کو کاٹنے کے لئے ہر عملی اقدام جہاد کے مترادف ہے۔ جو اس ہمت سے نئے قدم اٹھائیں گے وہ ملت اسلامیہ کے استحکام کا موجب بنیں گے اور انہیں یقیناً احیائے سنت کا اجر ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جو مشقت میں آسان ہو۔" (البیہقی فی شعب الایمان)

ایک اور حدیث یہ ہے:

"سب سے زیادہ برکت ایسی عورتوں میں ہوتی ہے جن کے نکاح میں زیادہ خرچ نہ کرنا پڑے۔" (مسند احمد، حاکم)

ہمیں حضور رسالت مآبؐ کے عہد سعادت کی شادیوں کا تصور کرنا چاہئے۔ کس سادگی سے نکاح ہوا کرتے تھے، نہ زیورات کی شرط تھی، نہ کپڑوں اور جوڑوں کی شرط تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک سرخ قمیض تھی۔ جس عورت کی شادی ہوتی وہ اسے منگا لیتی تاکہ نکاح کے موقع پر پہن سکے۔ یہی عروسی جوڑا تھا۔ ولیمہ کی دعوت کبھی ستو سے کی جاتی اور کبھی کھجوروں سے، کبھی بکری ذبح کر کے حاضرین کو کھانا کھلا دیا گیا۔ ایسا بھی ہوا کہ نکاح کرنے والے نے جب کہا کہ وہ لوگوں کی ضیافت کے لئے کچھ پیش نہیں کر سکتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حاضرین اپنے اپنے گھروں سے اپنا کھانا لائیں اور سب مل کر کھا لیں، ولیمہ ہو جائے گا۔ — غور فرمائیے کہ معاشرت میں کس درجہ سادگی، بے تکلفی، حسن اور اخلاص تھا۔ کیسی صاف ستھری اور پاکیزہ تھی، نہ کپڑوں اور جوڑوں کی حرص، نہ زیورات کی تمنا، نہ جہیز سامان کی ہوس، نہ عزیزوں اور دوستوں کو بے دردی اور شقاوت کے ساتھ زیر بار کرنے کی مذموم خواہش، نہ لمبے چوڑے اہتمام اور منصوبہ بندیاں، لیکن اس اخلاص، سادگی اور بے لوثی میں

خیر و برکت، قوت و شوکت اور عظمت و رفعت تھی۔ اسی سے اسلامی تاریخ کے اوراق آج بھی روشن ہیں۔ انہی پاکیزہ سیرت انسانوں کے ہاتھوں اسلام کو فروغ نصیب ہوا۔ جنگلی انسانیت کو ہدایت ملی۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے مقابلے میں روم و ایران کی متمدن سلطنتیں زیر ہو گئیں اور جن کا سیل رواں کسی طرح کی رکاوٹ کو خاطر میں لانے کو تیار نہ تھا۔ وہ جس سرزمین میں پہنچے اسے علم و حکمت، صنعت و تجارت، مساوات و اخوت اور تعمیر و ترقی سے مالا مال کر دیا لیکن ہم رسوم کے پابند، بدعات کے غلام اور جاہلی رواجوں کے شیدائی بن گئے ہیں۔ اقبال کے لفظوں میں:

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعث رسوائی پیغمبرؐ ہیں

ہمارے معاشرے کا ہر فرد اس امر کا متمنی ہے کہ اسے وہ کچھ سمجھا جائے جو درحقیقت وہ نہیں ہے۔ ہماری ریاکاری ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم دنیا کو چند لمحوں کا یقین دلائیں اور ہمیں صاحب حیثیت تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ یہ نہایت درجہ احمقانہ اور طفلانہ خیال ہے جس کی حقائق و واقعات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ بالفرض اگر دنیا نے ہم کو وہ کچھ سمجھ لیا جو ہم چاہتے ہیں تو حقیقت میں کیا بن جائیں گے:

چنیں شدیم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد

اجتماعی اور انفرادی دونوں سطح پر ہماری ذہنیت کا یہی عالم ہے۔ جیسے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تلوار کس قدر زنگ خوردہ اور بے جان ہے۔ ہمارا سارا زور نیام کو رنگنے اور مرصع بنانے پر ہے۔ اسراف، فضول خرچی، عاقبت نااندیشی اور مقروض خواہ فرد ہو یا قوم ان کا احساس خودداری کبھی برقرار نہیں رہ سکتا۔

کاش مصیبتوں اور الجھنوں میں گھری ہوئی ایک قوم کے اہل ثروت اور تعلیم یافتہ کہلانے والے، فرد اصلاح احوال کے لئے تعمیری انداز فکر اختیار کریں۔ تقریبات میں سادگی کو اصول بنائیں اور دولت کو تعلیم و تربیت، تبلیغ دین، خدمت خلق، اصلاح معاشرہ اور انسانی بھلائی پر صرف کرنے کی کوشش اور لائق تقلید مثال قائم کریں۔ ••

محمد اسمٰعیل خان

اقبالؒ - امید و آس اور یقین و ایمان کا پیامبر

دنیائے ادب کے ممتاز ادیب اور شاعر ڈاکٹر علامہ اقبالؔ علیہ الرحمہ نے اونگھتی ہوئی مشرقی فضا میں آنکھ کھولی تھی۔ پوری قوم خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ قوم کو اس خوابِ گراں سے بیدار کرنے اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کے لئے ایک مربوط و منظم نظامِ فکر کی ضرورت تھی۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ مسلمانوں کے پاس قرآن حکیم (جو کہ ایک مکمل نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات ہے) موجود تھا لیکن مسلمانوں نے اپنی جہالت اور حماقت کی بنا پر اس مقدس کتاب کی تعلیم کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کے سامنے مغرب کی تہذیب اور اس کی چمک دمک اپنے عروج پر تھی۔ چنانچہ معاملہ یہ ہوا کہ مسلمان اس کی ظاہری چمک دمک سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود اپنی تہذیب کو بھی فراموش کر بیٹھے .... بیسویں صدی کے آغاز میں دنیائے اسلام کی جو حالتِ زار تھی اس کا کسی قدر اندازہ ـــــ لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر سے ہو سکتا ہے ؎

مراکش جا چکا، ایمان گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ ناتواں کب تک

ظاہر سی بات ہے کہ ایسے پُر آشوب دور میں کسی شاعر کا اپنے جذبات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرنا کہ "میں اپنے بچھڑے ہوئے کارواں اور اپنی مصیبت زدہ قوم کو رات کی تاریکی میں لے نکلوں گا، اس حال میں کہ میری آہ شرر فشاں ہوگی اور میرا نفس شعلہ بار ہوگا ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

یہ شعر انھوں نے قیامِ انگلستان (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کے انقلابی دور میں کہا تھا اور ـــــ اسی دور میں اپنے ایک ہمدمِ دیرینہ شیخ عبدالقادر کو یہ پیغام بھیجتے ہیں ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور سے — بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

دنیائے ادب میں کسی ایسی مثال کی تلاش "دن میں چراغ لے کر ڈھونڈنے" کے مترادف ہوگی کہ کوئی شاعر ایک پُر آشوب دور سے تعلق رکھتا ہو، اس کی قوم گوناگوں خطرات و مشکلات میں گھری ہوئی ہو، وہ سنگین حالات کا گہرا شعور رکھتا ہو، اس کا دل غمِ ملت اور دردِ انسانیت سے معمور ہو اور پھر بھی اس کا کلام، کلامِ اقبال کی طرح امید و آس کا ایک سدا بہار گلشن ہو۔

چنانچہ جب اقبالؔ کی طبیعتِ حساس کو مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور اپنے قومی ماحول کی بے پناہ ظلمتوں اور یاس و ہراس کی تند و تیز آندھیوں میں امید کی شمعیں روشن کئے رہتے ہیں ـــــ فرماتے ہیں ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

اقبالؔ کی نگاہِ حقیقت شناس دیکھتی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف تمام ہی باطل طاقتیں متحد ہو چکی ہیں اور ان کی سب سے بڑی جو کوشش ہوتی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کے سینوں میں جو شمعِ ایمان روشن ہے، اسے کسی طرح بجھا دیا جائے اور عرب و عجم ہر جگہ ان کی جرأتِ دینی اور جذبۂ اسلامی کو قتل کے گھاٹ اتار دیا جائے کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو ہر مسلمان کو ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے سے بڑے مصائب و آلام میں بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آتی بلکہ خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتا ہے ـــــ اقبالؔ علیہ الرحمہ نے اپنی نظم "اقبال کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں اس حقیقت کا پوری طرح سے انکشاف کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا — روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات — اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج — مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

...... جب اقبالؔ مسلمانوں کی زندگی میں اس زوال و اضمحلال کی کیفیت کو دیکھتے ہیں کہ ان کا دینی شعور ختم ہو چکا ہے، ایمان کی چنگاریاں بجھ چکی ہیں، روحِ جہاد ختم ہو چکی ہے، مادیت اور نفع پرستی کا دور دورہ ہے تو وہ بے چین و بے قرار ہو جاتے ہیں اور خون کے آنسو ان کی

آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں اور ان کے قلم سے خونِ دل و جگر ٹپکنے لگتا ہے اور وہ "وارث" کے وارث سے شکوہ سنج ہو جاتے ہیں۔ ؎

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

ایک دوسری جگہ بڑے ہی حسرت آمیز انداز میں شاکی ہوتے ہیں کہ ؎

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

اقبالؒ کے نزدیک ان تمام خرابیوں کا باعث مومن کا وہ قلب ہے جس سے ایمان خالی ہو چکا ہے، وہ زندگی کے شعلے بجھ چکے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اگرچہ اقبالؒ کی نگاہوں کے سامنے ملت کی زبوں حالی عیاں ہے اور وہ اس حالت سے بے چین و بے قرار اور شکوہ سنج بھی ہیں لیکن...... چونکہ اقبالؒ یاس و قنوط کے شاعر نہیں بلکہ "امید و آس اور یقین و ایمان کے پیامبر" ہیں۔ اس وجہ سے وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ اگرچہ عالمِ اسلام کو سیاسی مصائب و آلام نے آ دبوچا ہے لیکن پھر بھی ان کی وجہ سے مسلمان بیدار ہو گئے ہیں اور ان میں نئی زندگی اور تازگی کے آثار پیدا ہو چلے ہیں، چنانچہ وہ اپنی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" میں فرماتے ہیں ؎

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

نیز اقبالؒ کے سازِ سخن میں چونکہ...... نوائے یاس کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے وہ اپنی قوم کو رجائیت سے بھرپور نغمے سناتے رہے تاکہ اس سے مضمحل دلوں کو تقویت حاصل ہو۔ فرماتے ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اور آگے کہتے ہیں ؎

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی
تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

اقبالؒ ان تمام تجربات و مشاہدات کے باوجود ملتِ اسلامیہ سے کبھی ناامید نہیں ہوئے بلکہ اس کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے پیشِ نظر برابر یہی کہتے رہے ؎

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اقبالؒ کے یہاں یاسیت و قنوطیت مفقود ہے اگر کوئی چیز ہے تو وہ رجائیت...... ہے۔

اقبالؒ کا یہ کارنامہ ان عظیم کارناموں میں سے ایک ہے جنھوں نے ان کو عصرِ حاضر کا عظیم ترین اسلامی مفکر، حکیم الامت، ترجمانِ حقیقت، مجددِ ملت اور اسلامی انقلاب کا سب سے بڑا داعی بنا دیا اور وہ وقت کے ایک عظیم قائد و رہنما مانے گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ مایوسی و مردہ دلی افراد و اقوام کے لئے نہایت مہلک چیز ثابت ہوتی ہے۔ ؎

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اقبالؒ کے یہاں یاس و قنوط کا فقدان ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یاس و قنوط کو

اپنے کر آدمی، یقین و ایمان کی اس عظیم طاقت کو کھو دیتا ہے جو کہ افراد و اقوام کی تقدیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملّت ہے

یہی وجہ ہے کہ اقبال ادب و فن میں یاسیت و قنوطیت کے سخت مخالف ہیں۔ کہتے ہیں کہ "شاعری اس آتش نوائی و دلکشی کی اس ناامید نفسی کا کیا فائدہ جو اپنے ماحول کو نہ گرما سکے اور کسی دل تک راہ پا سکے۔ نسیم صبح اور باد صبا اگر چمن کے لئے پیام بہار نہ لائیں تو ان کی مسیحا نفسی کس کام کی" ؎

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

غم اور رنج والم انسانی فطرت کی تعمیر و تخلیق کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان سے انسانی فطرت کے جوہر کھل کر عیاں ہوتے ہیں اور جلا پاتے ہیں — ان کو اقبال بھی ایک تعمیری و تخلیقی قوت سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال — غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گرد ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے — ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

وہ غم اور رنج والم کو عطیۂ خداوندی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غم فرہاد

وہ حکیم الامت ہیں اور ان کو زندگی گزارنے کا تجربہ بھی ہے۔ اسی وجہ سے وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی تکمیل کے لئے غم اور رنج والم ناگزیر ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

اقبال کے یہاں جہاں غم اور رنج والم کا احساس ہے وہیں ان کے پاس ان کو انگیز کرنے کا

ملا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آہ و فغاں ان کی شان قلندری کے خلاف ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شان درویشی
کہ ہے ضبط فغاں شیری، فغاں روباہی و میشی

وہ چونکہ اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں اس وجہ سے وہ کامل اعتماد کے ساتھ اپنے خزاں رسیدہ چمن کے ماتم گساروں کو یہ خوشخبری سناتے ہیں ؎

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے — یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

اقبال چونکہ یقین و ایمان کے بھی پیامبر ہیں اس وجہ سے وہ مرد مومن کو بار بار آواز دیتے ہیں جو کہ یاس و ناامید ہو کر زندگی کے کارواں سے بچھڑ گیا ہے۔ وہ مرد مومن کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
نہ ہو جب تک دلوں میں ایسا ایمان کامل — خدا بھی فسانہ؛ خودی بھی فسانہ
کوئی مرد مومن آیگا نہ یہ بستی — طریقے ہیں مشرق کے سب راہبانہ

اور آگے فرماتے ہیں ؎

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز — کاشانۂ ما رفت بتاراج غماں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

وہ اس شخص کو سچا مومن تصور ہی نہیں کرتے جو کہ "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ" پر ایمان نہ رکھتا ہو اور فرماتے ہیں کہ "یاس و قنوطیت کا شکار شخص مومن ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اس سے علم و عرفان پر زوال و اضمحلال طاری ہو جاتا ہے — جب کہ وہ مرد مومن جو کہ رجائیت کا پیکر ہو، اقبال اس کو خدا کا راز داں گردانتے ہیں — فرماتے ہیں ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

ـــ نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اقبالؒ کی نگاہ دوررس دیکھ رہی ہے کہ مغربی تہذیب اپنا کردار (PART) ادا کر چکی ہے۔ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ اس کی مثال اس پکے ہوئے پھل کی ہے جو کہ ٹوٹ کر گرنے والا ہو اور اس کی جگہ ایک نئی تہذیب لینے والی ہو۔ فرماتے ہیں ـــ

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

خود بخود گرنے کو ہے، پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

اس کے ساتھ اقبالؒ کو اس بات پر یقین ہے کہ عالم انسانیت کا مستقبل ملت مسلمہ سے عبارت ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ مرد مومن کو بار بار "خواب گراں" سے بیدار کر رہے ہیں تاکہ وہ جہانِ نو کا بانی اور معمار، انسانیت کے دکھوں کا مداوا بن سکے...... یہ ان کی آس ہے..... یہ ان کی امید ہے...... لیکن...... دوسری طرف...... کچھ دوسرا ہی منظر ہے، وہ یہ کہ امت مسلمہ ایک پر آشوب اور تاریک دور سے گزر رہی ہے۔ اسلامی ممالک میں شکست و ریخت کا المناک منظر درپیش ہے ـــ لیکن پھر بھی ـــ اقبالؒ ـــ امید و آس اور یقین و ایمان کا پیامبر ـــ ملت کے درخشاں مستقبل پر یقین و ایمان رکھتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ـــ

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

● ●

دینی مدارس پر کم سے کم اجرت کے قانون کا نفاذ نامناسب

وزیر اعلیٰ اترپردیش کے نام محترم امیر جماعت اسلامی ہند کا مکتوب

نئی دہلی۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی نے وزیر اعلیٰ اترپردیش مسٹر نرائن دت تواری کو اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ ان کی توجہ ریاست کے دینی مدرسوں پر کم سے کم اجرت قانون اور خواتین و بچوں کے اداروں کے لائسنس قانون ۱۹۵۶ء کے اطلاق کی نامناسب کوشش پر مبذول کرائی ہے۔ محترم امیر جماعت نے اپنے مکتوب میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور اور ہندوستان کے آئین کی دفعات کے حوالے سے کہا ہے کہ اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے، انھیں چلانے اور ان کے کردار کے تعین کا بنیادی حق حاصل ہے جسے محدود و مشروط یا مسدود نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں انسانی حقوق کا عالمی منشور والدین کو یہ حق بھی دیتا ہے کہ وہ پہلے طے کر سکیں کہ ان کے بچوں کو کس طرح کی تعلیم دی جائے گی۔

خط کا متن درج ذیل ہے:

شری تیواری جی!

میں آپ کو اترپردیش کے دینی مدرسوں سے متعلق عوامی اہمیت کے حامل ایک ایسے معاملہ کی یاد دہانی کی تکلیف دہ فریضہ انجام دے رہا ہوں جو ادھر کچھ عرصہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے وجہ تشویش بنا ہوا ہے۔

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ "کم سے کم اجرت قانون" کا دائرہ پوری ریاست میں پھیلے ہوئے دینی مدرسوں تک وسیع کرنے کے سلسلے میں قدم اٹھائے جا رہے ہیں، دریں اثنا یہ اطلاع بھی مل رہی ہے کہ "ویمنس اینڈ چلڈرنس انسٹی ٹیوشنز لائسنسنگ ایکٹ ۱۹۵۶ء (خواتین اور بچوں کے اداروں سے متعلق لائسنس قانون) کو بھی جس کا مقصد جعلی اور فرضی بچہ گھروں اور یتیم خانوں کی روک تھام ہے، تمام اقامتی دینی اسکولوں اور کالجوں پر لاگو کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔

آپ اس حقیقت سے یقیناً واقف ہوں گے کہ انسانی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۲۶ (۳) کے تحت والدین کو یہ اولین حق دیا گیا ہے کہ وہ بنیادی طور پر یہ طے کر سکتے ہیں کہ ان کے بچوں کو کس طرح کی تعلیم دی جائے گی اور اس ضمن میں یہ تذکرہ یقیناً بے محل نہیں ہوگا کہ ہندوستان نے بھی اس منشور پر دستخط کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے آئین نے تمام مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام و انصرام کے ساتھ ساتھ ان کے کردار اور ان کی نوعیت کے تعین کا حق بھی دیا ہے۔ ہندوستان کے آئین نے چونکہ ریاست کے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں کسی بھی نوع کی مذہبی تعلیم کو ممنوع قرار دیا ہے اس لئے ہندوستانی مسلمانوں نے دینی مدرسوں کا اپنا ایک الگ ڈھانچہ کھڑا کیا ہے (ان مدرسوں کی بہت بڑی تعداد اترپردیش میں ہی ہے) تاکہ دوسرے مضامین کے علاوہ قرآن و حدیث کی تعلیم بھی دی جا سکے جو مذہب اسلام کے تعلق سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کا مقصد مسلمان بچوں کو ایسے ماحول میں تعلیم دینا ہے جو ان کی ثقافت کے فروغ میں معاون بن سکتا ہو۔ اس طرح کے تقریباً تمام مدرسے مسلمانوں سے جنس و نقد کی شکل میں ملنے والے رضاکارانہ عطیات کے ذریعہ ہی چل رہے ہیں۔ یہ ان کے دسیوں ہزار بچوں کو مفت تعلیم کے ساتھ کھانے اور رہنے کی مفت سہولت بھی فراہم کر رہے ہیں۔

اب حکومت اترپردیش ضابطہ بندی کے ان نام نہاد اقدامات کی آڑ میں جو اقلیتی اداروں کے لئے نہیں بلکہ ملک و عوام کے مفادات کے پیش نظر بنائے گئے تھے، ہندوستانی اقلیتوں کے بنیادی حقوق کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔ آئین کی دفعہ ۲۹ (۱) ہندوستانی شہریوں کے تمام طبقوں کو اپنی مخصوص زبان، رسم الخط یا ثقافت کے تحفظ کا حق دیتی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح اترپردیش کے دینی مدارس کا قیام کلی طور پر ہماری زبان، رسم الخط اور ثقافت کے تحفظ کے لئے ہی عمل میں آیا ہے۔ آئین کی دفعہ ۳۰ (۱) ہندوستانی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی اداروں کے قیام و انصرام کا جو حق دیتی ہے وہ ایک مطلق حق ہے۔ ریاست مفاد عامہ کی آڑ میں ان پر کسی طرح کی تحدیدات عائد نہیں کر سکتی ہے۔ ایسے ہی قاعدوں اور ضابطوں کا اطلاق ان پر ہو سکتا ہے جو ان اداروں کو اقلیتوں کی تعلیم کا ایک موثر وسیلہ بنا سکتے ہوں۔

اس اصولی شرط کی تکمیل کے بغیر اگر ہندوستانی شہریوں کے بنیادی حقوق کو محدود یا مسدود کرنے کے سلسلہ میں کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے تو ہندوستانی آئین کی یہ دفعات ایک خوش کن سراب یا غیر حقیقی وعدہ ہی ثابت ہوں گی۔

دینی تعلیمی کونسل کے صدر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اس مسئلہ پر پہلے ہی آپ کی توجہ مبذول کرا چکے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے وزیر تعلیم کو اس معاملہ کا جائزہ لینے اور ضروری قدم اٹھانے کی ہدایت دیتے ہوئے دینی تعلیمی کونسل کے وفد کو انصاف کی یقین دہانی بھی کرائی ہے لیکن ابھی تک کوئی عملی شکل سامنے نہیں آسکی ہے۔

چنانچہ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اب اس مسئلہ کو مزید ٹال کر صورت حال کو اور زیادہ خراب نہ کریں، کسی اور کے کندھے پر خواہ وہ آپ کا کابینی رفیق ہی کیوں نہ ہو ذمہ داری ڈالنے کے بجائے فوری طور پر ہدایت جاری کر کے اپنی ریاست کے اقلیتی اداروں کو کم سے کم اجرت قانون اور خواتین و بچوں کے اداروں کے لائسنس قانون ۱۹۵۶ ایکٹ ۱۰ بابت ۱۹۵۶ء کی زد سے بچائیں۔

آپ کا مخلص

ابو اللیث، امیر جماعت اسلامی ہند

بقیہ: زمخشری اور "الکشاف"

علی تفسیر الکشاف (۴) مشاہد الانصاف علی شواہد الکشاف الشیخ محمد علیان۔

انھی چاروں حواشی کو کشاف کے سلسلے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے حواشی لکھے گئے اور بہت سے مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ان پر کلام کیا مثلاً امام رازیؒ۔ اس کے علاوہ اس کے بہت سے اختصار اور خلاصے بھی تیار ہوئے لیکن ان کا ذکر چنداں مفید نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے عمدہ خلاصہ بیضاوی کو کہا جا سکتا ہے۔ گرچہ مؤلف نے اس میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے، دوسری تفاسیر سے بھی باتیں نقل کی ہیں اور اپنی تفسیر کو خلاصۂ کشاف کا نام نہیں دیا ہے، تاہم اپنے بنیادی مباحث کے لحاظ سے وہ کشاف کا خلاصہ ہی ہے۔ ●●

تجویز برائے دینی مدارس پاس شدہ اجلاس عاملہ آل انڈیا مسلم مجلس اتر پردیش، ۱۳ر مئی ۱۹۸۹ء

(۱) آل انڈیا مسلم مجلس اتر پردیش کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس دینی مدارس پر رجسٹر ایکٹ اور دینی چیلڈرن ویلفیئر ایکٹ کے نفاذ کو تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اجلاس کی نظر میں حکومت کا یہ اقدام اقلیتوں کو اپنے ادارے قائم کرنے اور انہیں چلانے کی آئینی تحفظات کی خلاف ورزی ہے۔ اس ایکٹ کے نفاذ سے چھوٹے مدارس یقینی طور پر بند ہو جائیں گے جس سے ایک طرف بے روزگاری میں اضافہ ہوگا تو دوسری طرف مسلمان بچے دینی تعلیم سے محروم ہو جائیں گے۔

عاملہ کا یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ اردو کو ختم کرنے کی کوششوں کے بعد حکومت نے مسلمانوں کے دینی اقدار پر براہ راست حملہ کیا ہے۔ دینی تعلیم سے بے بہرہ مسلم قوم ہندوستان کے معاشرے میں اپنی انفرادیت بالکل کھو دے گی۔

مسلم مجلس کی عاملہ کا یہ اجلاس فیصلہ کرتا ہے کہ اپنی دینی تشخص کی بقا کیلئے مسلم مجلس مسلمانانِ اتر پردیش کو میدانِ عمل میں لائیگی۔ اس کے لئے عاملہ کا اجلاس فیصلہ کرتا ہے کہ ابتدائی طور پر مسلم مجلس جون کے پہلے ہفتہ میں لکھنؤ میں ایک عوامی مظاہرہ کرے گی تاکہ حکومت کو اس ایکٹ کو واپس لینے کیلئے مجبور کیا جائے۔

(ب) ساتھ ساتھ مجلس عاملہ کا اجلاس یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ حکومت کو دینی مدارس میں مداخلت کا جواز مہیا کرنے کے لئے ان اداروں کے اہتمام بھی ذمہ دار ہیں جنھوں نے اپنے مفادات اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دینی مدارس کو سوسائٹیز ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ کرا کر دینی اداروں کی آزادی اور مستقبل کو مخدوش بنا دیا ہے۔ اجلاس کی نظر میں اساتذہ و دیگر ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ اور طلبہ کے رہن سہن، کھانے پینے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کے دوسرے معاملات میں بہتر معیار بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ اجلاس کی نظر میں جو ملت ان اداروں کی موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اعانت کرتی ہے وہی مسلم قوم ان اداروں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے میں ہر ممکن تعاون دیگی۔

سید توفیق علی جعفری۔ آفس سکریٹری

شمس پیرزادہ

سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

شاتمِ رسولؐ کی سزا کا مسئلہ

صورتِ حال کا مختصر جائزہ

رشدی نے کتاب "شیطانی آیات" لکھ کر ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس پر شیطان کے چیلے جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور توہین، ازواج مطہرات پر الزام تراشی اور ان کی اہانت، دین میں طعنہ زنی، اور اس کا مذاق اڑانا ایسے ہی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس کو نہ خدا کا خوف ہو اور نہ اخلاقی حدود کی پروا۔ رشدی نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی جڑ پر کلہاڑا چلایا ہے اس لئے اس کا مرتد ہونا بالکل واضح اور اس بات پر علماء و فقہاء کا اتفاق ہے کہ مرتد کی سزا شریعت کی رو سے قتل ہے۔

مگر جہاں تک اس سزا کو نافذ کرنے کا تعلق ہے اس کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو دوسرے جرائم مثلاً چوری، زنا وغیرہ کی سزا کے نفاذ کے لئے ہیں۔ اگر ہندوستان یا برطانیہ جیسے ملک میں جہاں اسلام کو اقتدار حاصل نہیں ہے اگر چور کے ہاتھ کاٹے نہیں جا سکتے اور شادی شدہ زانی کو سنگسار نہیں کیا جا سکتا تو مرتد کو قتل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی مسلمان ان ممالک میں اپنے طور سے ان سزاؤں کو نافذ کرنا چاہے تو اس سے طرح طرح کے مسائل کھڑے ہوں گے اور وہ رائج الوقت قوانین کی گرفت میں آنے سے اپنے کو نہ بچا سکے گا، مزید برآں دعوتِ دین کا جو کام ان ممالک میں بحسن و خوبی انجام دیا جا سکتا ہے اس میں رکاوٹیں کھڑی ہوں گی نیز مسلمانوں کی پوزیشن دہشت گردوں کی ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے ان ممالک میں ناموسِ دین پر حملہ کرنے والوں سے نمٹنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنا ہوں گے کہ وہ آئندہ اس کی جسارت بھی نہ کر سکیں اور جو شر انھوں نے پھیلایا ہے اس کے مقابلہ میں "خیر" پوری طرح نمایاں ہو کر لوگوں کے سامنے آ جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ رسولؐ کی شان میں گستاخی کے

واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں اور اس کے مرتکب اکثر و بیشتر غیر مسلم ہوتے ہیں اور اگر کسی غیر مسلم شاتم رسولؐ کو کوئی مسلمان قتل کر دے تو اس میں فرقہ وارانہ فساد کے پھوٹ پڑنے کا امکان ہوتا ہے۔

کسی شرعی حکم کو اگر حالات پر منطبق کرنے کا سوال ہو تو اس سلسلہ میں سنجیدہ غور و فکر اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ بڑے جذباتی واقع ہوئے ہیں اور بعض مرتبہ علماء بھی ماشاء اللہ ان کی جذباتیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مسلمانوں کی بر وقت صحیح رہنمائی ہو نہیں پاتی اور انہیں زبردست دینی اور ملی نقصان پہنچ جاتا ہے۔

رشدی کی کتاب پر حکومت ہند نے پہلے ہی پابندی عائد کر دی تھی اس لئے یہاں احتجاجی تحریک چلانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جب خمینی نے رشدی کے قتل کا فرمان جاری کر دیا تو جذباتی مسلمانوں کو اس سے شہ ملی اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا اور بمبئی میں تو دفعہ ۱۴۴ کو توڑ کر پولیس کو اس بات کا موقع فراہم کیا گیا کہ وہ مسلمانوں پر ظلم ڈھائے چنانچہ پولیس فائرنگ کے نتیجہ میں دس بارہ افراد کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ گویا مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ جلوس نکالتے اگرچہ انھیں قانون کی خلاف ورزی کرنی پڑے، اور اگرچہ انھیں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑے۔ اگر یہ سب کچھ فرض تھا تو اس ہنگامہ آرائی کے بعد مسلمان خاموش کیوں ہو گئے۔ رشدی تو ابھی زندہ ہے اور حکومتِ برطانیہ نے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا پھر تحریک ختم کیوں کر دی گئی؟ جس تحریک کی بنیاد ہوش کے بجائے جوش پر ہوتی ہے اس کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا دور کی بات ہے، کہا نہیں جا سکتا کہ وہ کسی حادثہ سے دوچار ہو گی۔

ابھرنے والے سوالات

یہ صورت حال کا مختصر جائزہ تھا لیکن جو سوالات اس موقع پر ابھر کر سامنے آئے ہیں ان کی طرف ہمیں خاص طور سے توجہ کرنا ہے تاکہ ہم شرعی حالات کا حالات پر صحیح طور سے انطباق کر سکیں۔ مختلف گوشوں سے جو سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- کیا شاتم رسولؐ کی سزا اسلام میں وہی ہے جو مرتد کی ہے یا اسے بطور حد لازماً قتل کر دیا جائے گا۔ اسے نہ توبہ کرنے کا موقع دیا جائے گا اور نہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی؟

۲- شاتم رسولؐ اگر غیر مسلم ذمی ہو تو اس کی سزا کیا ہے؟

۳- شاتم رسول مسلمان ہو یا غیر مسلم، اگر وہ کسی غیر اسلامی ملک کا شہری ہے تو کیا وہاں کے مسلمانوں پر شرعاً واجب ہوگا کہ وہ اس پر شرعی حد جاری کریں، اگرچہ ملک کا قانون اس کی اجازت نہ دیتا ہو؟

۴- کیا مسلمانوں کی کسی حکومت کے سربراہ یا پیشوا کو یہ فرمان جاری کرنے کا حق ہے کہ شاتم رسول اگر کسی غیر اسلامی حکومت کا شہری ہے تو اس کے باوجود مسلمان اس کو قتل کر کے دم لیں؟

۵- ہمارے ملک میں آئے دن رسولؐ کی شان میں گستاخی کے اور دین میں طعنہ زنی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور یہ شرارت بالعموم غیر مسلم فرقہ پرستوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس فتنہ کا مقابلہ مسلمان کس طرح کریں اور اس کے سدباب کے لئے کیا تدابیر اختیار کریں؟

ان سوالات پر سنجیدگی سے غور کرنا اور ان کا جواب کتاب و سنت سے معلوم کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر شرعی احکام کو منطبق کرنے میں کتاب و سنت سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

کیا شاتم رسولؐ کو بطور حد قتل کرنا واجب ہے؟

اس بات پر علماء اور فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی مسلمان (نعوذ باللہ) رسول کو سب و شتم کرے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی یہ حرکت ایمان کے منافی ہے، اور مرتد کی سزا اسلام میں قتل ہے اس لئے اسلامی حکومت اسے قتل کی سزا دے گی لیکن اسے توبہ کا موقع دیا جائے گا یا نہیں یا اگر وہ خود اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے علانیہ توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی یا نہیں؟ تو اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

علماء اور فقہاء کے اقوال

علامہ ابن تیمیہ نے الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں اس مسئلہ پر مبسوط بحث کی ہے اور اس میں فقہاء کے مختلف اقوال نقل کئے ہیں جس کی روشنی میں تلخیص ماہنامہ "رہ گذر" حیدرآباد کے اپریل ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے لیکن تعجب ہے کہ اس تلخیص میں امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کی رائے کو حذف کر دیا گیا ہے حالانکہ علامہ ابن تیمیہ نے صاف طور سے لکھا ہے کہ:

"جہاں تک ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا تعلق ہے وہ کہتے ہیں کہ ذمی کے رسول کی شان میں سب وشتم کرنے سے نقض عہد نہیں ہوتا اور نہ ذمی کو اس بنا پر قتل کیا جاسکتا ہے البتہ اس کے اظہار پر اسے تعزیری سزا دی جاسکتی ہے جس طرح ان کی طرف سے کسی ایسے منکر کے اظہار پر انھیں سزا دی جاسکتی ہے جس کے کرنے کا اس کو اختیار نہیں ہے مثلاً اپنی کتابوں وغیرہ کے لئے اظہار صوت اور اس رائے کو طحاوی نے ثوری سے نقل کیا ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ جس چیز میں ان کے نزدیک قتل (کی سزا متعین) نہیں ہے مثلاً قتل بالمثقل (کسی پر اتنا بوجھ لاد دیا جائے کہ وہ مرجائے) اور غیر قُبُل میں جماع کے فعل کا بار بار ارتکاب ایسی صورت میں امام کو اختیار ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والے کو قتل کرے۔ اسی طرح اسے یہ بھی اختیار ہے کہ مصلحت کی بنا پر مقررہ حد پر سزا کا اضافہ کرے۔ اس قسم کے جرائم کے سلسلہ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے قتل کی جو سزا منقول ہے اسے وہ اس بات پر محمول کرتے ہیں کہ ان کی رائے میں مصلحت اسی میں تھی۔ وہ اسے سیاسۃً قتل کرنے سے تعبیر کرتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ان جرائم میں جن کے بار بار ارتکاب سے ان میں شدت پیدا ہوگئی ہو اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے ہوں کہ قتل ان کے لئے مشروع ہوا ہے امام کو اختیار ہے کہ وہ ایسے مجرم کو تعزیراً قتل کردے۔ اسی لئے ان میں سے اکثر نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ ذمیوں میں سے جو شخص نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو بکثرت سب وشتم کرے اسے قتل کردیا جائے اگرچہ وہ گرفتاری کے بعد اسلام قبول کرلے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے سیاسۃً قتل کردیا جائے گا اور یہ بات ان کے اصول کی طرف راجع ہے۔"

(الصارم المسلول ص ۱۰-۱۱)

مطلب یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رسول کی شان میں سب وشتم کرنے والے کو تعزیری سزا دینے کے قائل ہیں لیکن ہر حال میں قتل کی سزا دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اگر اس کا ارتکاب اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم شہری (ذمی) کی طرف سے ہوا ہے تو بطور حد اسے قتل کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اسے اسلامی حکومت تعزیری سزا دے گی اور اگر مصلحت متقاضی ہو تو اسے قتل کرنے کا بھی اختیار ہے۔

شامی میں بھی علامہ ابن تیمیہ کی اس عبارت کو الصارم المسلول کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے اور اس کے بعد علامہ ابن عابدین نے اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ:

ترجمہ: "انھوں نے (یعنی علامہ ابن تیمیہ نے) یہ صراحت فرمائی ہے کہ ہمارے نزدیک ایسے شخص کو قتل کرنا جائز ہے جبکہ اس سے بار بار اس حرکت کا صدور ہوا ہو اور اس نے اس کو ظاہر کر دیا ہو۔" (درمختار - ج ۳، ص ۳۰۵)

شامی میں یہ صراحت بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان سب وشتم کا مرتکب ہو تو اسے قتل کر دیا جائے گا اگر وہ توبہ نہ کرے۔

(قوله فالظاهر) ای بالسب (قوله فلو من مسلم قتل) ای ان لم یتب لا مطلقا خلافا لما ذکره فی الدرهنا والبزازیة وغیرهما فانه مذهب المالکیة لا مذهبنا۔

پھر علامہ ابن عابدین بعض احناف کی اس رائے کا ذکر کرتے ہوئے کہ کافر کو نبی کی شان میں سب وشتم کرنے کی بنا پر بطور حد قتل کر دیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ توبہ سے حد ساقط نہیں ہوتی اور بندہ جب اپنے حق کا مطالبہ کرے تو وہ ساقط نہیں ہوتا جس طرح کہ تہمت کی حد ساقط نہیں ہوتی ان سے اختلاف کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ترجمہ: "اس بات پر کسی دلیل کا ہونا ضروری ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ حاکم کو اس قسم کا مطالبہ کرنے کا حق ہے حالانکہ یہ ثابت نہیں ہے بلکہ جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے بہت سے لوگوں کو معاف کر دیا تھا جنھوں نے آپ کو اذیت پہنچائی تھی اور برا بھلا کہا تھا۔ ایسے لوگوں کا اسلام آپ نے قبول کیا تھا جیسے ابو سفیان وغیرہ۔"

(شامی ج ۳، ص ۳۱۷)

اس عبارت سے واضح ہے کہ علامہ ابن عابدین سب وشتم کرنے والے کافر پر قتل کی حد لازماً جاری کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ توبہ کرے تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے پیش نظر اس کی توبہ امام (حکومت) قبول کرسکتا ہے۔ اور آگے چل کر انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "کتنے ائمہ مجتہدین (شاتم رسول) کی توبہ قبول کرنے اور قتل کے ساقط ہونے کے قائل ہیں۔" (شامی ج ۳، ص ۳۱۷)

"یہ صریح بات ہے جو قاضی عیاض نے الشفاء میں اور سبکی، ابن تیمیہ اور ان کے

مسلک کے ائمہ نے یہی ہے کہ احناف کا مسلک توبہ قبول کرنے کا ہے اور ان سے کوئی دوسرا قول نقل نہیں کیا۔" (شامی ج ۳، ص ۳۱۹)

انھوں نے ابن بزازی کے اس قول کی تردید کی ہے کہ شاتم رسول کو بطور حد قتل کر دیا جائے گا اور اس کے لیے اصلاً توبہ نہیں ہے، اور اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ بات بڑی ہی عجیب ہے۔ وہ کس طرح کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے جب کہ ائمہ مجتہدین کا اس مسئلہ میں اختلاف موجود ہے۔" (شامی ج ۳، ص ۳۱۹)

نیز انھوں نے امام یوسف کا یہ قول کتاب الخراج سے نقل کیا ہے کہ:

"جو مسلمان مرد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں سب و شتم کرے یا آپ کو جھٹلائے یا آپ کی تکذیب کرے یا آپ میں عیب نکالے یا آپ کی تنقیص کرے تو اس نے اللہ تعالیٰ سے کفر کیا اور اس کی بیوی جدا ہو گئی۔ اگر توبہ کی تو درست ہے ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح عورت کو بھی اگر وہ اس جرم کی مرتکب ہوتی ہے البتہ ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ عورت کو قتل نہیں کیا جائیگا بلکہ اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا۔" (شامی ج ۳، ص ۳۱۹)

پھر خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں:

"خلاصہ یہ کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے شاتم کے کفر کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور نہ اس کے قتل کے مباح ہونے کے بارے میں ہے۔ یہ بات ائمہ اربعہ سے منقول ہے۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ اگر اس نے اسلام قبول کر لیا تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی یا نہیں؟ تو احناف کے نزدیک قبول کی جائے گی اور شافعیہ کا مشہور قول بھی یہی ہے کہ ان کے نزدیک بھی توبہ قبول کی جائے گی۔ البتہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ اختلاف قتل کے (شرعی) حد ہونے یا نہ ہونے کی بنا پر ہے۔" (شامی ج ۳، ص ۳۱۹-۳۲۰)

اور جہاں تک دیگر فقہا کا تعلق ہے علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرنے والے کی توبہ قبول کرنے کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ (امام) مالک اور (امام) احمد کا مشہور قول یہی ہے کہ اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے توبہ کرنے سے قتل ساقط ہوگا اور یہی قول لیث بن سعد کا ہے اور

قاضی عیاض نے بیان کیا ہے کہ سلف کا یہی قول مشہور ہے اور جمہور علماء کا بھی نیز اصحاب شافعی کا بھی یہی ہے لیکن (امام) مالک اور (امام) احمد سے یہ بھی منقول ہے کہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور یہی قول امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے اور امام شافعی کے مسلک میں بھی مشہور قول یہی ہے اس بنا پر کہ مرتد کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔" (الصارم المسلول ص ۳۱۳)

علامہ ابن تیمیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"جو مسلمان اللہ کو یا کسی نبی کو برا بھلا کہے اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور یہ ارتداد ہے۔ ایسے شخص سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا اگر اس نے رجوع کیا تو ٹھیک ہے ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔" (الصارم المسلول ص ۲۰۱)

واضح ہوا کہ حضرت عبد اللہ ابن عباس سب و شتم کرنے والے کو توبہ کا موقع دینے کے قائل ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ شاتم رسول کو توبہ کا موقع دینے کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس بات کے قائل ہیں کہ اس کو بطور شرعی حد کے قتل کر دیا جائے۔ انھوں نے اپنی اس رائے کو بڑی شدت سے پیش کیا ہے لیکن انھوں نے اس سے مختلف رائے رکھنے والے علماء و فقہاء کی آراء کو بھی پیش کر دیا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہے۔

التشریع الجنائی میں عبد القادر عودہ نے لکھا ہے کہ بعض فقہاء نے قتل کی پانچ اقسام بیان کی ہیں جن میں سے ایک قسم مندوب ہے:

"اور وہ ہے غازی کا اپنے قریبی کافر کو قتل کرنا اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کو سب و شتم کرتا ہو۔"

(التشریع الجنائی ج ۲، ص ۶)

گویا بعض فقہاء کے نزدیک شاتم رسول کو قتل کرنا واجب نہیں ہے بلکہ مندوب ہے۔ پھر عبد القادر عودہ امام مالک کا یہ مسلک بیان کرتے ہیں کہ جو شخص کسی نبی کو سب و شتم کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اس کی توبہ قبول کی جائے گی اگرچہ وہ اس کا اعلان کرے کیونکہ اس حالت میں اس کو قتل کرنا خاص حد کو جاری کرنا ہے۔ (ج ۲، ص ۴۴۷)

اور امام شافعی کا مسلک وہ بیان کرتے ہیں کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور نبی کو سب و شتم کرنے والے کی توبہ قبول کی جائے گی اور اسے توبہ کا موقع دیا جائے گا۔ ان کے مسلک میں یہی راجح ہے اور اس مسلک میں دوسری رائیں بھی ہیں، ایک یہ کہ سب و شتم کرنے یا تہمت لگانے کی بناء پر حداً قتل کر دیا جائے گا کیونکہ نبی پر تہمت لگانے یا سب و شتم کرنے کی شرعی حد قتل ہے اور قذف کی حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی اور دوسری رائے یہ ہے کہ قذف پر اسّی کوڑوں کی سزا دی جائے گی اور سب و شتم پر تعزیری سزا۔"

(التشریع الجنائی ج ۲، ص ۲۵۷ بحوالہ اسنی المطالب ج ۴ ص ۱۲۲، نہایۃ المحتاج ج ۷، ص ۳۹۹) اور امام احمد بن حنبل کے مسلک کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"جو شخص اللہ اور اس کے رسول کو سب و شتم کرے یا تنقیص کرے اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ اس کے فساد عقیدہ اور اس کے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ استخفاف کرنے کی دلیل ہے۔" (التشریع الجنائی ج ۲ ص ۲۶۷)

لیکن حنبلی مسلک کی کتاب المغنی میں ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی والدہ پر قذف اسلام سے ارتداد اور ملت سے خروج ہے۔ اسی طرح بغیر قذف کے آپ کو سب و شتم کرنا بھی۔ البتہ اگر کسی نے بغیر قذف کے سب و شتم کیا تو اسلام قبول کرنے کی صورت میں اس کی سزا ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے کی سزا اسلام قبول کرنے کی صورت میں ساقط ہو جاتی ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہنے کی سزا بدرجہ اولیٰ ساقط ہونی چاہئے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم مجھے برا بھلا کہتا ہے اور یہ بات اسے زیب نہیں دیتی۔ اس کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ میں نے بیٹا بنا لیا ہے حالانکہ میں احد صمد ہوں۔ نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ مجھے کسی نے جنا، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نصرانی جو اس کا قائل ہوتا ہے اس کے قبول اسلام کی صورت میں اسلام اس کے اس گناہ کو مٹا دیتا ہے۔" (المغنی ج ۸ ص ۲۳۳)

معلوم ہوا کہ حنبلی مسلک میں بھی شاتم رسول کے لئے توبہ کی گنجائش موجود ہے اور توبہ کی صورت میں قتل ساقط ہو جاتا ہے۔

فقہاء کے ان اقوال سے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے کہ شاتم رسول کی توبہ قبول نہ کرنے

اور ہر حال میں اس کے واجب القتل ہونے پر فقہاء اور ائمہ کا اجماع ہے بلکہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔ خاص طور سے حنفی مسلک اور شافعی مسلک میں توبہ کا موقع دینے یا توبہ قبول کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

کتاب و سنت کا حکم

اختلاف کی صورت میں ہمیں معاملہ کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹانے کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس مسئلہ میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کریں اور ان سے براہ راست رہنمائی حاصل کریں۔ یہ بات تو واضح ہے کہ قرآن کی کوئی نص ایسی نہیں ہے جس میں شاتم رسول کی توبہ قبول نہ کرنے اور بطور حد اسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ سورۂ توبہ کی جس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے:

"اگر یہ عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعنہ زنی کریں تو کفر کے پیشواؤں (لیڈروں) سے لڑو کہ ان کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں۔ (ان سے لڑو) تاکہ وہ باز آجائیں۔"

مگر اس سے شاتم رسول کی توبہ قبول نہ کئے جانے پر استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس آیت کا آخری ٹکڑا لعلھم ینتھون "تاکہ وہ باز آجائیں" اس کی تردید کرتا ہے نیز اس میں قتال (جنگ) کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ قتل کا، اور جنگ کسی فرد واحد سے نہیں کی جاتی بلکہ گروہ اور قوم سے کی جاتی ہے۔ مزید برآں اس میں دین پر طعنہ زنی کرنے والوں سے لڑنے کا حکم ہوا ہے اور دین پر طعنہ زنی کے مفہوم میں جس طرح رسول کو سب و شتم کرنا شامل ہے اسی طرح اللہ، ملائکہ اور انبیاء کو برا بھلا کہنا اور اسلام کا مذاق اڑانا بھی شامل ہے۔

قرآن کی متعدد آیات ایسی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کافروں اور منافقوں کی اذیت دہی سے صرف نظر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کافر تو آپؐ کو پاگل کہتے تھے مگر آپ اس برائی کے جواب میں ان کے ساتھ بھلائی کرتے رہے یہاں تک کہ آپؐ کی اصلاحی کوششیں جہاد کے مرحلہ میں داخل ہو گئیں اور منافقوں کی اذیت دہی کے کچھ واقعات ایسے ہیں کہ قرآن نے ان کا خاص طور سے ذکر کیا ہے مثلاً سورہ منافقون میں منافقوں کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

"وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہنچے تو عزت والا ذلت والے کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔" (منافقون ۸)

یہ بات جیسا کہ روایات میں آتا ہے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے کہی تھی اور یہ واقعہ غزوہ بنی المصطلق سے واپسی کے وقت یعنی ۶ھ میں پیش آیا تھا مگر نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے درگذر سے کام لیا۔ اسی طرح سورۂ توبہ میں منافقین کی رسولؐ کی شان میں طنز و تشنیع اور اذیت دہ باتیں کرنے کا ذکر ہے مثلاً:

"ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو نبی کو اذیت پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کان کا کچا ہے۔" (سورۂ التوبہ ۶۱)

قرآن نے ایسے لوگوں کو عذاب الیم کی وعید سنائی لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے شان میں گستاخی کرنے والے منافقین کو قتل کی سزا دی تھی جب کہ یہ آیت غزوۂ تبوک سے واپسی پر یعنی ۹ھ میں نازل ہوئی تھی جب کہ مدینہ میں شرعی حدود نافذ العمل تھے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے درگذر سے کام لیا ہے اور آپ کے اسی اسوۂ حسنہ کے پیش نظر مسلمان بڑے فخر کے ساتھ یہ مصرعہ پڑھتے ہیں کہ

سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں۔

مگر جب موجودہ دور کے کافروں یا منافقوں کی طرف سے گستاخی کی کوئی بات سامنے آتی ہے تو ان کی زبان سے یہ مصرعہ ادا نہیں ہوتا اور وہ نبی کے عفو و درگذر کے پہلو کو نظر انداز کر کے جوش انتقام میں ہنگامہ کھڑا کرنے لگتے ہیں۔

حدیث و سیرت میں کچھ واقعات ایسے ضرور بیان ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کی ہجو کرنے یا آپ کو سب و شتم کرنے والوں کو آپ کی ہدایت پر یا آپ سے اجازت لئے بغیر قتل کر دیا گیا اور جب آپ کے علم میں لایا گیا تو آپ نے ان کے خون کو بے قیمت قرار دیا۔ یہ یہود کا لیڈر تھا جو نبی کی ہجو کیا کرتا تھا لیکن اس کو محض ہجو کرنے کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا بلکہ اس لئے قتل کیا گیا کہ وہ اولاً نقض عہد کا مرتکب ہوا تھا اور یہود اور مشرکین دونوں کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے پر ابھار رہا تھا یہاں تک کہ اس نے مکہ جا کر مشرکین کو ورغلایا اور آپ کے خلاف سازش کی جس کے نتیجہ میں غزوۂ احد کا واقعہ پیش آیا۔ وہ بڑی بے غیرتی سے اپنے اشعار میں مسلمان عورتوں پر پھبتیاں کسا کرتا تھا۔ (دیکھئے سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۴۳۶)

ایسے مفسد اور حربی کو اگر آپ نے مباح الدم قرار دیا تو یہ اس کے سنگین جرم کی قرار واقعی سزا تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ سب و شتم کرنے والا اگر توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قابل قبول نہیں ہے اور اسے لازماً بطور حد کے قتل کر دیا جائے۔ قرآن و حدیث کی کوئی نص ایسی نہیں ہے جو اس کی تائید میں پیش کی جا سکے۔ قتل کے جن واقعات سے استدلال کیا جاتا ہے ان میں سے بعض تو واقدی جیسے راویوں کے بیان کردہ ہیں جن کو حجت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا اور بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے ان کے خون کو بے قیمت قرار دیا۔ یہ واقعات پوری تفصیلات کے ساتھ اگرچہ بیان نہیں ہوئے ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس وقت واسطہ حربی کافروں سے تھا اور بعض لوگ مرتد ہو کر دشمن کے کیمپ میں شامل ہو جاتے تھے اس لئے ان کو عدالت میں لا کر ان پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر کچھ ایسے افراد کو صحابہ کرام نے موقع پا کر قتل کر دیا تھا جو کفر میں بہت آگے نکل گئے تھے اور سب و شتم پر اتر آئے تھے تو اس سے یہ استدلال کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ کسی بھی سب و شتم کرنے والے کو نہ عدالت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اسے اپنی صفائی کا موقع دینے کی اور اگر وہ گڑگڑا کر توبہ کر رہا ہو تو بھی اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اسے لازماً قتل کر دیا جائے گا۔ واقعات کی توجیہ قرآن کی روشنی میں کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو نہ قرآن و سنت میں مطابقت پیدا ہو سکے گی اور ہر شخص کسی مسلمان پر رسول کی گستاخی کا الزام لگا کر اس کو قتل کر دے گا اور یہ معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ واقعی وہ اس جرم کا مرتکب ہوا تھا یا نہیں؟

کچھ ایسے واقعات بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو سب و شتم کے باوجود معاف کر دیا تھا مثلاً حضرت ابوبکرؓ کے والد کا قصہ ہے کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرتے تھے مگر آپ نے ان کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی بالآخر وہ مسلمان ہو گئے۔ ایسے واقعات کی یہ توجیہ کرنا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو معاف کرنے کا اختیار تھا اور ہم کو یہ اختیار نہیں ہے، دعویٰ بلا دلیل ہے۔ قرآن کا عام اعلان ہے:

"کافروں سے کہو کہ اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ ہو چکا وہ معاف کر دیا جائے گا۔"

(انفال ۔ ۳۸)

شاتم رسول پر سزا کا نفاذ اسلامی ممالک میں

جہاں تک مسلمانوں کی اپنی حکومتوں کا تعلق ہے شاتم رسول پر خواہ وہ ذمی ہو یا منافق و مرتد، عدالت میں مقدمہ چلا کر جرم ثابت ہونے کی صورت میں وہ اس کو قتل کی سزا دے سکتی ہیں بشرطیکہ وہ توبہ نہ کرے۔ اس شر کے سدباب کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی حکومتیں سخت اقدامات کریں تاکہ ان ممالک میں کوئی شخص رسولؐ کی شان میں گستاخی کرنے یا دین کا مذاق اڑانے کی جرأت نہ کرے۔

مگر مسلمانوں کے کسی ملک کے سربراہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے شہری کو قتل کرنے کا فرمان کرے الا یہ کہ وہ اس ملک کے جنگ کی حالت میں ہو کیونکہ اس کا نفاذ حد کے حدود سے باہر ہے نیز اس سے بدامنی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور اس سے بین الاقوامی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جناب سید شہاب الدین ایم۔پی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ:

"چونکہ شاتم رسول غیر ملکی ہے۔ غیر ملک میں رہتا ہے اور اس غیر ملک کے کسی شہری کو اس ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لئے کہنا آج کے بین الاقوامی قانون کے خلاف ہوگا...... میں بہرحال اس رائے کا ہوں کہ اسلامی قانون کی حدود اسلامی ریاست کے باہر نافذ نہیں کی جا سکتیں۔ قانون کا اطلاق اسی پر ہو سکتا ہے جو اسلامی حکومت کے دائرہ میں واقع ہو۔" (ماہنامہ رہ نگر۔ حیدرآباد مئی ۱۹۸۹ء)

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس طرح کے فرامین جاری کئے جاتے رہے تو عجب نہیں کہ ایک مسلمان ملک کا سربراہ دوسرے مسلمان ملک کے سربراہ پر اس کے مخالف اسلام یا مرتد ہونے کا الزام لگا کر اس کے قتل کا فرمان جاری کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ صورت مسلمانوں ہی کے لئے خون خرابہ کا باعث ہوگی اس لئے حدود کا پاس و لحاظ ضروری ہے۔

شاتم رسول کی سزا کا نفاذ غیر اسلامی ممالک میں

رہے ہندوستان اور برطانیہ جیسے غیر اسلامی ممالک، تو وہاں نہ شرعی عدالتیں قائم ہیں اور نہ شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لئے مسلمانوں کو

قوت نافذہ حاصل ہے اس لئے کسی مرتد یا شاتم رسول کو قتل کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے اس فتنہ سے نمٹنے کے لئے کچھ دوسری تدابیر ہی اختیار کرنی ہوں گی۔

شرعی سزاؤں کو نافذ کرنا امام (اسلامی حکومت) کی ذمہ داری ہے اور افراد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ چنانچہ فقہ السنہ میں ہے:

"فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حاکم یا جو اس کا نائب ہو وہی حدود قائم کرے گا اور افراد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کا نفاذ عمل میں لائیں۔" (فقہ السنہ السید سابق ج ۲، ص ۲۶۲)۔

اور علامہ ابن تیمیہ نے شاتم رسول کے قتل کرنے پر جو زور دیا ہے تو اس کا تعلق بھی وقت کی اسلامی حکومت ہی سے ہے یہاں تک کہ انہوں نے آقا کے غلام پر حد نافذ کرنے کے جس اختلافی مسئلہ کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق بھی اسلامی حکومت کے دائرہ میں رہنے والوں ہی سے ہے۔ ان کی معرکۃ الآراء کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" کا راقم سطور نے مطالعہ کیا ہے اور جہاں تک وہ سمجھ سکا ہے علامہ ابن تیمیہ نے غیر اسلامی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری قرار نہیں دی ہے کہ وہ رسول کی شان میں سب و شتم کرنے والے شخص کو قتل کریں کہ غیر اسلامی ملک میں رہتے ہوئے بھی ان پر ایسا کرنا شرعاً واجب ہے اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا انطباق ہندوستان اور برطانیہ جیسے ممالک پر نہیں ہوتا۔

پھر علامہ ابن تیمیہ نے عبداللہ ابن ابی کے شان رسالت میں توہین کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو (عبداللہ ابن ابی کو) اس لئے قتل نہیں کیا کہ کہیں لوگ اسلام سے متنفر نہ ہو جائیں (یہ خیال کر کے کہ آپ اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں) کیونکہ اس وقت اسلام کمزور حالت میں تھا۔" (الصارم المسلول ص ۱۷۹)

علامہ ابن تیمیہ کی یہ توجیہ اگر صحیح ہے کہ اس وقت (یعنی ۵ھ میں) اسلام کمزور تھا اس لئے عبداللہ بن ابی کو گستاخی کی سزا نہیں دی جا سکی۔ تو آج ہندوستان میں اسلام کہاں سے طاقتور ہے۔ ۸ھ میں تو مسلمان جہاد کرنے کی پوزیشن میں آ گئے تھے۔ اس کے باوجود اگر اسلام کے

کمزور ہونے کا لحاظ کیا گیا اور شاتم رسول منافق پر سزا کا نفاذ عمل میں نہیں لایا گیا تو ہندوستان کے مسلمان نہ جہاد کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور نہ شرعی حدود کو نافذ کرنے کی پوزیشن میں۔ پھر ان سے یہ مطالبہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے منافقوں کو قتل کی سزا دیں۔ اصل میں علامہ ابن تیمیہ نے اپنے وقت کے حالات کو سامنے رکھ کر جب کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت بھی تھی، اور ذمیوں کی طرف سے سب وشتم ایذا رسانی کے نتیجے میں نقض عہد کا اندیشہ تھا جیسا کہ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے اپنی رائے دلائل کے ساتھ پیش کر دی۔ ان کی اس رائے کو موجودہ حالات میں ہندوستان اور برطانیہ جیسے غیر اسلامی ممالک پر چسپاں کر دینا کسی طرح صحیح نہیں اور نہ علامہ ابن تیمیہ کا یہ منشا رہا ہوگا۔

جب یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب وشتم کرنے والوں سے درگزر کرتے رہے ہیں اور اپنے کٹر دشمنوں کو بھی معاف کرتے رہے ہیں جبکہ انھوں نے توبہ بھی نہیں کی اور ایمان لے آئے اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ مرتد کو اور شاتم رسول کو، جبکہ انھوں نے توبہ نہیں کی قتل کی سزا بھی دی گئی تو ہمارے لئے ان دونوں ہی اسووں میں رہنمائی کا سامان ہے۔ حالات کی مناسبت سے جو بات دینی مصالح سے زیادہ مطابقت رکھنے والی ہوگی اس کو بروئے کار لانے میں موانع نہیں ہوں گے۔ اس پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ گستاخی، سب وشتم اور دین پر طعن زنی کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں، اس لئے جرم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے یہ طے کرنا ہوگا کہ مجرم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔

مرتد رشدی برطانیہ میں ہے، اس لئے ہندوستان کے علماء کے لئے یہ کہنا آسان ہوا کہ اس کو قتل کر دیا جائے لیکن کیا وہ یہ فتویٰ اس وقت بھی دیں گے جب کہ یہاں خدا نخواستہ کسی غیر مسلم کی طرف سے گستاخی کا کوئی واقعہ پیش آ جائے؟ اور آئے دن کسی نہ کسی پرچے میں فرقہ پرست رسول کی شان میں گستاخی اور اسلام پر طعن وتشنیع کی باتیں شائع کرتے رہتے ہیں تو کیا ایسی صورت میں مجرم کو قتل کرنا واجب ہوگا؟ عوام قتل کی تحریک چلائیں گے اور علماء کھل کر ان کی تائید کریں گے یا آگے بڑھ کر خود ہی قتل کرنے کی سعادت حاصل کریں گے؟

باقی آئندہ

غزلیں

شفیع اللہ خاں راز

شورِ محشر ہے زندگی کی صدا
کون سنتا ہے آدمی کی صدا

نفسی نفسی پڑی ہے دنیا میں
کوئی سنتا نہیں کسی کی صدا

قتل گاہیں سجائے بیٹھے ہو
اور لب پر ہے زندگی کی صدا

ایٹمی جنگ جاگ اٹھی ہے
الاماں! بیسویں صدی کی صدا

برف زاروں میں حشر برپا ہے
جب سے ابھری ہے شعلگی کی صدا

ظلمتوں کا مزاج برہم ہے
میرے لب پر ہے روشنی کی صدا

اپنے دشمن بھی خوب ہیں اے رازؔ
چھپ کے سنتے ہیں روشنی کی صدا

نغمۂ مسافر

عطا عابدی ، دربھنگہ

او دین کے مسافر — او دین کے مسافر
منزل کی فکر کیسی — رہزن کا خوف کیسا
جب دوجہاں کا خالق — حافظ ہے اور ناصر

او دین کے مسافر — او دین کے مسافر
ہے تیرا کام بڑھنا — سورج کی طرح چڑھنا
آیاتِ زندگی کو — دنیا کی نظر سے پڑھنا
پُر خار وادیوں میں — دیوانہ وار بڑھنا
کچھ مشکلیں ملیں گی — کچھ حادثے ملیں گے
لیکن نہ ہو نمایاں — لغزش کسی قدم سے
اِک روشنی ملے گی — ملّت کو تیرے دم سے
ہر چوٹ ہنس کے سہنا — تبلیغِ حق کی خاطر

او دین کے مسافر — او دین کے مسافر
جو ظلمتوں میں گم ہیں — تو ان کو روشنی دے
محرومِ زندگی کو — پیغامِ زندگی دے
لب خشک ہو رہے ہیں — تو ان کو تازگی دے
تجھ پر بھی قرض ہے کچھ — دنیائے آب و گل کا
ہرگز نہ آنے پائے — مقصد پہ حرف تیرے
بے خوف ہو کے چلنا — سچائیوں پہ مرنا
جو کچھ تجھے خدا نے — احکام ہیں سنائے
دنیا کو وہ بتا دے — نقشِ دوئی مٹا دے
سوتوں کو اب جگا دے — حق کا پتا بتا دے
دیکھ! آشیانِ وحدت — الحاد میں گیا گھر
او دین کے مسافر — او دین کے مسافر

"آزادیٔ نسواں"

بقلم: عبدالمجید ندوی

آج آزادیٔ نسواں کا نعرہ پورے عالم میں گونج رہا ہے۔ لوگ جوق در جوق اس تحریک کے گرد جمع ہو رہے ہیں جیسے کہ صدیوں بعد متاعِ گم گشتہ ہاتھ آگیا ہو۔ پردے کے حامیوں پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں، ان کو بنیاد پرست اور فنڈامینٹلسٹ قرار دیا جا رہا ہے اور مذہب اسلام کو ناکارہ ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کی جا رہی ہے کیونکہ وہ پردے کا داعی اور مخلوط تعلیم کا سخت مخالف ہے۔ اہلِ یورپ کی نگاہ میں اسلام ہی ترقی کے لئے سدِ راہ بنا ہوا ہے کہ وہ عورت کو گھر کی چہار دیواری میں مقید کر کے اس کی آزادی کو سلب کرتا اور مردوں سے اس کا ربط گھٹانا چاہتا ہے بلکہ مردوں کو عورتوں پر افسری کا طریقہ سکھاتا ہے۔

بے شک انسان فطری طور پر آزاد ہے لیکن آزادی کا مفہوم وہ نہیں جو تحریکِ آزادیٔ نسواں کے دلدادہ لیتے ہیں۔ انسان ان مختلف قوتوں کے مجموعے کا نام ہے جن میں بعض قوتیں اگر صفاتِ حسنہ کی طرف آمادہ کرتی ہیں تو بعض قوتیں برائیوں کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس میں سیکڑوں خواہشیں ایسی موجود ہیں جن کے اثر سے وہ عقل و تمیز کھو بیٹھتا ہے اس لئے اسلام نے انسان کی فطری آزادی کو ایک خاص حد تک مقید کر دیا ہے۔ ہر صنف کے طبعی فرائض متعین کر دیئے ہیں، ان فرائض کے لحاظ سے وہ جس حد تک آزادی کی مستحق ہے اسے بخشی ہے اور جو آزادی اسکے فرائض میں خلل انداز ہوتی ہے اسے قطعی جرم قرار دیا ہے۔ عورت کو قدرت نے دنیا میں جس غرض سے پیدا کیا ہے وہ نوعِ انسانی کی بقاء اور اس کی حفاظت ہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لئے جن اعضاء اور اعصاب میں جس تناسب کی ضرورت تھی قدرت نے اسے عطا کئے ہیں۔ لہٰذا جس طرح مردوں کی قوت سے یہ امر خارج از امکان ہے کہ وہ عورت کے طبعی فرائض میں حصہ لیں، اسی طرح عورت کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ مردوں کے عملی اور تمدنی مشاغل میں شریک ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے دنیا کی ذمہ داریوں کو خود ہی

دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک نوعِ انسانی کی بقاء و حفاظت، دوم انسانی ضروریات کی تکمیل کے وسائل کی فراہمی۔ پہلا کام عورت کے ذمّے قرار دیا گیا اور دوسرا مردوں کے ذمّہ۔ اگر کوئی صنف اپنی ذمہ داری کو بدلنا چاہے تو سراسر فطرت سے جنگ ہوگی۔

نسلِ انسانی کی بقاء و حفاظت کے لئے قدرت نے مسلسل چار دور متعین کئے ہیں حمل، وضع، رضاعت اور تربیت۔ ان میں سے ہر دور عورت کی زندگی کا نہایت دشوار مرحلہ ہوتا ہے، بالخصوص ابتدائی تین مرحلوں میں تو عورت کو جن سخت حالات سے گزرنا پڑتا ہے ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ بعض وقت بے چاری اپنی زندگی تک سے مایوس ہو جاتی ہے۔ ان نازک گھڑیوں میں بچے اور ماں دونوں ہی کی صحت و حفاظت کے لئے خاص احتیاط اور علاج کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کریں کہ جس صنف کے طبعی فرائض ایسے اہم اور دشوار ہوں کیا وہ مردوں کی طرح عام تعلیم حاصل کر کے دنیا کی تمدنی و سیاسی کشمکش میں شریک ہو سکتی ہے؟ اس مسئلہ پر یورپ کے تمام بڑے مصنفین متفق ہیں، ایک مصنف کہتا ہے "عورتوں کا طبعی فرض نوعِ انسانی کی بقاء اور حفاظت ہے۔ اس دائرے سے عورت جب بھی باہر قدم نکالتی ہے تو وہ عورت نہیں رہتی بلکہ عورت اور مرد کے علاوہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جاتی ہے۔" وہ یورپ کی عورتوں کو عورت تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے اور آزادی کو ایک خاص خبط اور تمدنی وحشت قرار دیتا ہے۔

علاوہ ازیں مرد اور عورت جسمانی اور دماغی قوی میں بھی برابر نہیں ہو سکتے تو پھر عورت مرد کے دوش بدوش کیسے چل سکتی ہے؟ یورپ کے مشاہیر عقلاء اور علماء کی سائنٹفک رائیں بھی متفق ہیں۔ انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لفظ عورت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے: "مرد و عورت میں اعضائے تناسل کی ترکیب و صورت کا اختلاف اگرچہ ایک بڑا اختلاف نظر آتا ہے لیکن صرف یہی اختلاف نہیں ہے، عورت کے اور تمام اعضاء سر سے پیر تک مرد کے اعضاء سے مختلف ہیں۔"

علمی تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے قد کا اوسط طول مرد کے قد کے اوسط طول سے بارہ سینٹی میٹر کم ہے۔ عضلات کے حجم و قوت کے لحاظ سے بھی عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی

قلب، جو انسانی زندگی کا مرکز ہے، اس میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے، عورت کا قلب مرد کے قلب سے ساٹھ گرام چھوٹا اور خفیف ہوتا ہے۔ سرعتِ تنفس کے لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں عظیم الشان اختلاف ہے۔ مرد ایک گھنٹہ میں تقریباً گیارہ گرام کاربن جلا دیتا ہے مگر عورت چھ گرام سے کچھ زائد جلاتی ہے۔ اسی طرح حواسِ خمسہ میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ بیلی کہتے ہیں کہ مرد کی قوتِ شامہ عورت کی قوتِ شامہ سے بدرجہا قوی ہے، ذوق اور سماع کا احساس بھی عورت سے مرد کا بہت قوی ہے۔"

علامہ ابیرذر اور سیرجی کا کہنا ہے کہ مرد کی قوتِ لامسہ عورت سے بہت فائق ہے۔" قوتِ ادراک کا مرکز بھیجا ہے۔ ماہرین نفسیات نے لکھا ہے کہ مرد کے بھیجے کے وزن کا اوسط عورت سے سو گرام زیادہ ہے۔ [1]

اس لئے عورت اور مرد میں عدم مساوات کوئی جبری چیز نہیں بلکہ عورت کی طبعی خاصیت ہوتی ہے۔ بھلا اس قدر اختلاف کے باوجود عورت اور مرد قدم سے قدم ملا کر چل سکتے ہیں؟ اگرچہ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بڑا اختلاف جو مرد اور عورت کے دماغی اور جسمانی قوی میں پایا جاتا ہے اس کی وجہ حالتِ غلامی ہے جس میں ایک زمانہ دراز سے عورت گرفتار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آخر افریقہ اور امریکہ کی بعض جنگلی قوموں کو آزادی سے کس نے روکا، ان کی زندگی آج تک سراسر آزادانہ ہے، اس کے باوجود دونوں کے جسمانی اور دماغی قوی کا باہمی اختلاف جس طرح پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے بعینہ اسی طرح ان جنگلی مرد و عورت میں بھی نظر آتا ہے۔ اور صرف انسانوں میں کیا محدود، حیوانات میں بھی یہ فرق اظہر من الشمس ہے بلکہ نباتات و جمادات تک میں یہ تفاوت پایا جاتا ہے اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عورت مرد کے دوش بدوش چلنے سے فطری طور پر قاصر ہے۔ اگر کوئی فطرت سے بغاوت پر آمادہ ہو تو خود اپنے اوپر ظلم ڈھانے والا ہے " ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه "۔ عورت کا مردوں کے اشغال میں شریک ہونا قوانینِ فطرت کی سراسر

---

[1] المرأة المسلمة ۔ فرید وجدی ص ۲۳

خلاف ورزی ہے۔ عورت کو کمال اس میں حاصل ہے کہ وہ مردوں کے کاموں میں دخل نہ دے ورنہ دونوں کے باہمی میل جول سے ایک فتنۂ عظیم رونما ہوگا جس کا روکنا بڑی بڑی حکومت کے بس سے باہر ہوگا۔ بطور مثال یورپ اور امریکہ کو پیش کر سکتے ہیں کہ جہاں فحاشی، بے راہ روی کا بازار گرم ہے۔ لڑکیاں قبل از وقت مائیں بن رہی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

گزشتہ قوموں کی تاریخ پر غائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بربادی اور تباہی کے اسباب کیا تھے۔ چنانچہ اس مقام پر رومن امپائر کے انحطاط کو بطور مثال پیش کر سکتے ہیں۔ وہی رومن امپائر تمام یورپین ممالک کی ماں ہے یہ وہ پہلا سرچشمہ ہے جس سے موجودہ یورپ کے متمدن ملکوں کی نہریں نکلیں، رومن حکومت کی بنیاد چھ صدی قبل مسیح پڑی تھی۔ ابتداءً اس کی حالت بہت ابتر تھی پھر صدیوں ترقی کرتی ہوئی رفتہ رفتہ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئی۔ بقول انسائیکلوپیڈیا کے مصنف کے اس حکومت میں بھی عورتیں پردے کی قید میں رکھی جاتی تھیں جس دور میں رومانی عورتیں پردے میں تھیں وہاں کی قوموں نے ہر فن میں کمال اور مہارت حاصل کی۔ سنگ تراشی، عمارت سازی، فتوحات ملکی اور سلطنت واقعتاً کے مالک بن بیٹھے لیکن اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد ان میں رفتہ رفتہ عیش پرستی اور لذت کوشی عام ہونے لگی جس کی خاطر انھوں نے اپنی عورتوں کو پردے کی قید سے آزاد کر دیا۔ پھر کیا تھا ہوس پرست مردوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں اور ان کی آبروریزی اور ہتک عزت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان کے اخلاق خراب کر کے ان کی پاکیزگی کے دامن پر داغ لگائے۔ ان کی شرم و حیا کی مہر توڑ دی۔ عورتیں تھیٹروں میں جانے لگیں، کلبوں میں نیم عریاں رقص کرنے لگیں اور اپنے سُریلے اور ترنم ریز نغموں کے ذریعہ مردوں کے جذبات بھڑکانے لگیں جس کی وجہ سے اس معاشرے میں عورتوں کی قدر و منزلت غیر معمولی شدت سے بڑھ گئی۔ مرد عورتوں کی پوجا کرنے لگا حتیٰ کہ ممبران پارلیمنٹ" بھی عورتوں کے ووٹوں کے شدت سے منتظر ہوتے ان کے معمولی اشاروں سے بڑے بڑے عہدیداروں کو معزول کر دیا جاتا۔ بس یہ حالت ہوتے ہی رومانی حکومت پر ایسی تباہی آئی کہ آج تک اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس میں عورتوں کی بدنیتی اور بداخلاقی کا مطلق دخل نہ تھا بلکہ انھیں بے پردہ کیا گیا، مرد ان پر مائل ہونے لگے اور انکے لئے

آپس میں کشتا مرنا شروع کر دیا جس سے تمام ملکی امور درہم برہم ہو گئے۔

پھر اس کے بعد ردعمل کے طور پر عورتوں پر مظالم کے ایسے پہاڑ توڑے جانے لگے کہ انسانی درندوں کو بھی شرم آئے۔ رومن مردوں نے اپنی عورتوں کے لئے گوشت کھانا، ہنسنا بولنا اور بات چیت کرنا بھی حرام قرار دے دیا، ان کے منہ پر "موز سیر" نامی مضبوط قفل لگا دیا کہ کچھ بول نہ پائے۔ یہ حالت صرف عام عورتوں کی نہیں ہوئی بلکہ رئیس و امیر، کمینہ و شریف، عالم و جاہل سب کی عورتوں پر یہی آفت آن پڑی یہاں تک کہ ایک کانفرنس محض اس لئے بلائی گئی کہ غور کیا جائے کہ کیا عورت میں بھی جان ہے؟ پھر ان کو طرح طرح سے ستایا گیا، ان کے جسم پر گرم تارکول ٹپکایا گیا، گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر گھسیٹی گئیں، ستونوں سے باندھ دی جاتیں اور نیچے آگ روشن کر دی جاتی جس کی سوزش سے ان کا گوشت گل گل کر جاتا، وہ بے چاری اسی بری حالت میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتیں۔

لیکن یہ حیرت انگیز کایا پلٹ کیوں کر ہوئی؟ کل تک جو جسم سے لے کر دلوں تک حکومت کرتی تھیں آج ان کے ساتھ ایسا گھناؤنا برتاؤ کیوں کیا جانے لگا؟ جواب یہ ہے کہ جس وقت رومانیوں کی حکومت و سلطنت انتہائی عروج پر پہنچ گئی پوری دنیا اشک بھری نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگی تو ان کے دلوں میں عیش پسندی اور راحت طلبی نے گھر بنا لیا اور یہ دونوں ہی امر بغیر عورت کے اختلاط کے ناممکن تھے اس لئے عورتوں کو پردے سے آزاد کر دیا گیا اور اپنے نفس کی خواہش حسب منشا پوری کرنے لگے۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ہر میدان میں عورتوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ مرد و عورت کے آزادانہ میل جول سے ان کے اندر ایسی کمینہ عادتیں اور گندہ خصلتیں پیدا ہو گئیں کہ پڑھ کر چہرہ شرم سے پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے جن سے ان کی ہمتیں پست ہو گئیں، ارادے مضمحل ہو گئے، باہمی چپقلش، خونریزی اور خانہ جنگی کا بازار گرم ہو گیا اسی دوران بہت سی نئی نئی باتیں ایسی بھی پیش آئیں جنھوں نے خیالات کا رخ پلٹ دیا اور لوگوں کے دلوں میں یہ راسخ ہو گیا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ محض عورت ہے اس لئے عورتوں سے ان کی ناراضگی بڑھنے لگی اور نوبت ان انسانیت سوز مظالم تک پہنچ گئی جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

باقی ص ۷۶ پر

دینی مدارس کی روایات اور نصاب کی خصوصیات

پروفیسر محمد سلیم

مدارس کا طریق تدریس

ہند و پاکستان میں دینی مدارس کی تعلیم تین حصوں میں منقسم تھی ابتدائی، ثانوی، اور اعلیٰ تعلیم۔ ان کی تعلیم مکاتب، مدارس فارسی اور مدارس عربی میں ہوتی تھی۔ ان مدارس میں تدریس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ تدریس لازماً روزانہ ہوتی تھی، چھٹی بہت کم تھی، ناغہ کسی دن نہیں ہوتا تھا تعلیم روزانہ دو وقت ہوتی تھی، صبح کا وقت عموماً نئے سبق کے لیے۔ استاد نیا سبق اس وقت تک نہیں دیتا تھا جب تک پچھلا سبق اچھی طرح یاد نہ ہو جائے اور استاد اس کو سن نہ لے۔ یہیں سے طلبہ کے اندر فرق پیدا ہو جاتا تھا ذہین بچے روزانہ سبق یاد کر لیتے تھے اور غبی لڑکے دو دن ایک ہی سبق میں اٹکے رہتے تھے ہر بچہ کا سبق جداگانہ ہوتا تھا۔ استاد ہر بچے پر جدا جدا توجہ دیتا تھا۔ قدیم تعلیم میں درسی کتاب کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ طالب علموں کی جماعت بندی کتاب کے نقطۂ نظر سے ہوتی تھی۔ سال کے اعتبار سے نہیں ہوتی تھی۔

شام کا وقت آموختہ یاد کرنے اور سبق دہرانے کے لئے ہوتا تھا۔ جوں جوں بچے تعلیم میں ترقی کرتے جاتے تھے دہرانے کا وقفہ بھی طویل ہوتا جاتا تھا۔ پہلے روزانہ، پھر ہفتہ میں دو دن اور آخر میں ہفتہ میں صرف ایک دن بچے سبق دہراتے تھے یہ جمعرات کا دن ہوتا تھا۔ اس روز آدھے دن کی چھٹی ہوتی تھی۔

ابتدائی درجات اور ثانوی درجات کے لئے یہ طریق تدریس نہایت مفید ہے۔ قرآن مجید پڑھنے کے لئے تو یہ طریقہ حد درجہ مفید ہے۔ جدید اسکولوں کا طریقہ جس میں آموختہ کے بغیر روزانہ آگے سبق دے دیا جاتا ہے، ناقص طریقہ ہے، بچے کی بنیاد میں کمزوری باقی رہ جاتی ہے۔

فارسی درجات میں بھی یہی طریقہ تدریس رائج تھا آموختہ سنا جاتا تھا، یاد کرنے پر کافی زور تھا۔ اس طریقہ سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ایک ایک بچے کے اندر علم کی بنیاد مضبوط ہو جاتی تھی، عام طور پر جو کچھ اس نے پڑھا ہوتا تھا وہ اسے ازبر یاد ہوتا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کسی امتحان کے لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

درجات عالیہ کی تعلیم کا معاملہ بالکل مختلف تھا اس لئے یہاں کا طریقہ تدریس بھی مختلف تھا۔ درجات عالیہ کی نصاب سازی میں فاضل اساتذہ کے پیش نظر چند مقاصد ہوتے تھے۔

۱۔ کوئی شخص دنیا بھر کے علوم و فنون کا احاطہ نہیں کر سکتا نہ تمام کتابوں کا مطالعہ کر سکتا ہے چند ہی مضامین کی اور چند ہی کتب کی تدریس ممکن ہے۔

۲۔ تعلیم یافتہ شخص میں یہ قدرت اور یہ ملکہ پیدا ہونا چاہئے کہ وہ مشکل سے مشکل مضمون کی اور مغلق سے مغلق کتاب کو پڑھ سکے اور سمجھ سکے جو بھی کتاب اس کے سامنے آئے وہ اس کو پڑھ سکے اور سمجھ سکے۔

۳۔ تعلیم یافتہ شخص کے اندر غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہونی چاہئے اس کی قوت تنقید بیدار ہونی چاہئے تاکہ اندھوں اور جاہلوں کی طرح نہ وہ ہر چیز کو قبول کر لے اور نہ ہر چیز کو رد کر دے۔ اس کے اندر خود اعتمادی کا ملکہ پیدا ہونا چاہئے وہ نرا مقلد اور تابع دار نہ بن جائے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ خاص انداز کی کتابوں کو نصاب میں شامل کرتے تھے۔ وہ سیدھے سادے انداز کی کتابوں کو نصاب میں شامل نہیں کرتے تھے، بلکہ مشکل عبارت، پیچیدہ تراکیب اور مغلق معنی والی کتابوں کو نصاب میں شامل کرتے تھے۔ وہ دانستہ طور پر ایسی کتابیں نصاب میں رکھتے تھے جن کو پڑھنے اور سمجھنے میں دقت ہو، دشواری ہو۔ مفہوم متعین کرنے میں شاگردوں کو، اور استاد کو خوب محنت کرنا پڑے۔ متن کو انتہائی اختصار اور اغلاق سے لکھا جاتا تھا۔

طریقہ تدریس یہ تھا کہ پہلے طالب علم خود ہی اس کتاب کو پڑھتا تھا، اس کا مفہوم متعین کرتا تھا، اس کے نکلنے ہوئے مفہوم پر اگر کوئی اعتراض وارد ہوتا تو وہ اس کا جواب سوچتا

تھا۔ پھر استاد کے سامنے درس شروع ہوتا۔ استاد ہر طالب علم کو بولنے کا موقع دیتا تھا کہ وہ اپنا مفہوم پیش کرے، اگر کوئی طالب علم بحث میں حصہ نہیں لیتا تھا تو وہ غبی اور کندۂ ناتراش شمار ہوتا تھا۔ استاد کے سامنے مفہوم متعین کیا جاتا تھا۔ صرفی، نحوی، منطقی، فکری غرض جس قدر بھی اعتراضات اور شبہات اس مفہوم پر ذہن میں آسکتے تھے وہ طلبہ استاد کے سامنے پیش کرتے تھے استاد ان سب کے جوابات دیتا تھا گفتگو یہ ذہنی ورزش جاری رہتی تھی جب تک پوری طرح اطمینان نہیں ہو جاتا تھا درس ختم نہیں ہوتا تھا۔ استاد اپنی جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔ درس ختم ہو جانے کے بعد ہر طالب علم اس سبق کو دہراتا تھا۔ اعتراضات، شبہات اور جوابات سب کو دہراتا تھا۔ طلبہ آپس میں مذاکرہ کرتے تھے، بحث کرتے تھے پیچیدگی حل مطالب، اس کا درس مع ردِ شبہات اور اعتراضات، پھر حجرہ میں سبق کا اعادہ یہ تین مرحلے تھے جن سے روزانہ ایک سبق گزرتا تھا۔

اس طریق تدریس سے طالب علم کے اندر (۱) مشکل ترین عبارت اور مشکل ترین مضمون کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی (۲) طلبہ میں غور و فکر کرنے اور ردّ و قبول کرنے کا ملکہ پیدا ہوتا تھا (۳) طلبہ میں اظہار بیان پر قدرت اور قوتِ گویائی پیدا ہو جاتی تھی۔ (۴) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طالب علم کے اندر ایک طرح کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی تھی۔ پانچ سات سال کے درس میں یہ صفات طالب علم کے اندر مستحکم ہو جاتی تھیں۔ اس طریق تدریس میں کسی امتحان کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ انگریزوں کے غلبہ تک یہی طریقہ تدریس ملک میں رائج تھا۔

بلاشبہ یہ طریق تدریس اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتا ہے اور کالجوں کا طریقہ تعلیم اس کے مقابلہ میں ناقص ہے۔ کالج کے طریقہ میں نہ مشکل عبارت کے سمجھنے کی اور نہ محنت کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ نہ قوتِ گویائی پیدا ہوتی ہے اور نہ غور و فکر کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

ﻟﮧ اغلاق و اختصار میں شاید اس بات کو بھی دخل حاصل تھا کہ اس دور میں علماء کے ذہنوں پر منطق اور فلسفہ کا غلبہ بہت زیادہ تھا اور وہ ہر بات کو اختصار سے منطقی انداز میں لکھتے تھے۔

اس طریق تدریس سے طالب علم کے اندر خود اعتمادی پروان نہیں چڑھتی مزید برآں طالب علموں کے ذہنوں میں حصولِ علم کا جذبہ حاوی رہتا ہے جبکہ کالج کے طالب علم کے سر پر امتحان کا تصور سوار رہتا ہے۔ ان کے یہاں تعلیم کا مقصد حصولِ علم نہیں ہے بلکہ حصولِ سند ہے جس سے نوکری ملتی ہے۔ ان نقائص کی بنا پر مولانا مناظر احسن گیلانی نے کالج کے طریق تدریس کو "گھوڑ تکا درس" لکھا ہے۔

جدید دور کے دینی مدارس

مغلوں کے آخری دور میں دینی مدارس کے نصابات میں تخصص کے واضح رجحانات پائے جاتے تھے۔ مشترک نصابات کے ساتھ تخصص کا رنگ بھی پایا جاتا تھا۔ خیرآبادی مدارس (رامپور) میں ایرانی فلسفہ کا غلبہ تھا فرنگی محل کے مدارس (لکھنؤ) میں فقہ کو اہمیت حاصل تھی۔ پنجاب کے مدارس میں نحو کی تعلیم پر زیادہ زور تھا۔ انگریزی کمپنی کے زیر اہتمام مدرسہ میں تاریخ اور ادب کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز کے انتقام سے مسلمانوں کو جس ہلاکت اور غارت گری سے سابقہ پیش آیا وہ اس سے قبل نہ مرہٹوں کے دور میں اور نہ جاٹوں کے دور میں پیش آیا تھا مسلمانوں پر ہر طرف قبرستان کی سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس موقع پر سر سید احمد خاں (۱۸۹۸ء ـــ ۱۸۱۸ء) کو مسلمانوں کے بقائے وجود کی فکر دامن گیر ہوئی اور وہ اس کے لئے کوشاں ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۸۰ء) کو مسلمانوں کے دینی سرمائے کے تحفظ کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس کے لئے انھوں نے ۱۸۶۷ء میں سہارنپور کے ایک غیر معروف قصبے دیوبند میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ ان کے پیش نظر دینی سرمائے کا تحفظ تھا اس لئے انھوں نے خیرآباد، فرنگی محل، دہلی، پنجاب اور دہلی کالج سب کی روایات کو یکجا جمع کر لیا (تاریخ دیوبند از محبوب رضوی ص: ۱۰۴) جس کی وجہ سے سرمایہ تو محفوظ ہو گیا مگر دیوبند کا نصاب تعلیم بہت بھاری بھر کم ہو گیا۔ ان کے پیش نظر دینی روایات کا تحفظ تھا تاکہ ماضی سے تسلسل قائم رہے پہلے مدرسہ دیوبند کا نصاب ہفت سالہ تھا پھر مولانا محمد یعقوب صاحب دیوبندی کے زمانہ میں نصاب پر نظر ثانی کی گئی اور نصاب تعلیم کو ہشت سالہ بنا دیا گیا۔[1]

ﻟﮧ شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی سیاسی تحریک: از مولانا عبید اللہ سندھی: ص ۱۲۳

دارالعلوم دیوبند میں درج ذیل علوم کی تعلیم سات سال میں دی جاتی تھی:

۱۔ علوم لسانی (۲۳) صرف و نحو، بلاغت، معانی، عربی ادب، کلام شعراء۔

۲۔ علوم دینی (۳۲) تفسیر، احادیث، فقہ، اصول فقہ، عقائد، عبادات۔

۳۔ علوم عقلی (۲۱) منطق اور فلسفہ۔

۴۔ علوم طبعی (۷) حساب، ہندسہ، الجبرا، فلکیات، اصطرلاب، طبعیات۔

کل ۸۳۔ ابتدائی درجات کی کتب شامل کر کے شاید ۱۰۶ بن گئی ہوں۔

تفصیل کے لئے دیکھئے ضمیمہ ۲

نقشہ اختلافات تعداد کتب درس نظامی و تعداد سنین تعلیم منقول از "ورقۃ التاج" مؤلفہ مولوی محمد حسین مطبوعہ ۱۹۲۰ء۔

	تعداد کتب	مع کتب تکمیل	مدت تعلیم	مع درجہ تکمیل	مدت کتب حدیث
۱۔ مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ	۶۳	۶۷	۸	۹	۱
۲۔ مدرسہ عالیہ رامپور	۶۲	۷۰	۱۰	۱۲	۱
۳۔ مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن	۶۲	۰	۱۲	۰	۴
۴۔ مدرسہ فتحپوری دہلی	۷۷	۰	۸	۰	۲
۵۔ مدرسہ مولوی فخر الدین	۱۰۷	۰	۱۲	۰	۳
۶۔ مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر	۶۸	۷۷	۱۰	۱۲	۳

تعلیم کا فارسی نصاب

ہندوستان کے قدیم مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج تھا اس کی امتیازی خصوصیت نصاب تعلیم کا فارسی حصہ تھا۔ نصاب تعلیم کا ایک حصہ عربی تھا جو اسلام کا ورثہ تھا جو عالم اسلام سے ہندوستان منتقل ہوا تھا۔ دوسرا حصہ فارسی تھا جو اہل عجم کا ورثہ تھا جو ایران و توران سے ہندوستان منتقل ہوا تھا۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی نصاب تعلیم کے یہ دونوں حصے یہاں ہندوستان میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں کے قدیم دینی مدارس میں یہ دونوں حصے پڑھائے جاتے تھے۔ تعلیم کا آغاز فارسی حصہ سے ہوتا تھا

اور تعلیم کی تکمیل عربی حصہ سے ہوتی تھی کوئی شخص اہل علم اس وقت تک شمار نہ ہوتا تھا جب تک کہ اس نے عربی زبان اور دینی علوم کی تحصیل نہ کر لی ہو۔ فارسی حصہ اور عربی حصہ یعنی دینی علوم اور دنیوی علوم کی تحصیل سے فارغ ہو کر طالب علم کوئی ہنر سیکھتا تھا کوئی ذریعہ معاش ڈھونڈتا تھا۔ عربی نصاب کی تحصیل کرنے والے کو عالم اور فارسی نصاب کی تحصیل کرنیوالے کو فاضل کہتے تھے اور دونوں نصابوں کی تکمیل کرنے والے شخص کو عالم فاضل کہتے تھے۔

برصغیر ہندوستان پاکستان میں سلطان محمود غزنوی (۱۰۳۰ء) کے وقت سے فارسی مملکت کی سرکاری زبان رہی ہے۔ ساری دفتری کارروائی، ساری سرکاری مراسلت فارسی زبان میں ہوتی تھی۔ اسلامی عہد حکومت کے بعد مرہٹوں اور سکھوں کے دور اقتدار میں بھی یہ حیثیت برقرار رہی۔ البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ۱۸۳۵ء میں فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر ڈالی، اس پر کاری ضرب لگائی، اس کے بعد اب فارسی زبان برصغیر پاک و ہند سے مٹ گئی۔

عہد اسلامی میں چھوٹے بچے کی تعلیم کا آغاز چار سال چار ماہ اور چار دن کی عمر میں ہو جاتا تھا، سب سے پہلے وہ قرآن مجید پڑھتا تھا۔ قرآن مجید کی تعلیم کے فوراً بعد فارسی کی تعلیم کا آغاز ہو جاتا تھا۔ بلاد عجم ترکستان، ایران اور برصغیر ہندو پاکستان میں فارسی زبان کا غلبہ تھا اس لئے یہاں ایک نصاب تعلیم فارسی زبان میں بتدریج ارتقاء پذیر ہو گیا تھا۔ معمولی تغیرات اور مقامی ضابطوں کے ساتھ وہ ان ممالک میں پڑھایا جاتا تھا۔ تقریباً سارا نصاب تعلیم دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا اس لئے سارا نصاب دنیوی علوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نصاب تعلیم کو پڑھنے کے بعد ایک شخص معاملہ فہم، کاردان اور حکومت اور دفتری مراسلت سے واقف ہو جاتا تھا وہ ایک عملی انسان بن جاتا تھا۔ سیاسی اور معاشرتی زندگی کے تقاضے بخوبی سمجھتا تھا اور ان سے متعلق امور سرانجام دینے کا اہل بن جاتا تھا۔

اکبر بادشاہ کے وزیر ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں فارسی نصاب تعلیم کے حسب ذیل مضامین بتائے ہیں۔ دینی علوم کا تعلق عربی نصاب سے ہے اس لئے ان کا

یہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ وہ مختلف ہے: اخلاق، حساب، سیاق (بہی کھاتہ، حساب رکھنا)، زراعت، مساحت (پیمائش زمین)، ہندسہ، فلکیات، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، علوم طبیعی، علوم الٰہی (مابعد الطبیعات)، تاریخ اور ہندوؤں کے لئے نیائے، بیدانت، پاتنجلی۔ (ج اوّل: ص ۳۰۲)۔

چندر بھان برہمن شاہ جہاں بادشاہ کا میر منشی تھا۔ وہ اپنے بیٹے تیج بھان کو مندرجہ ذیل فارسی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہے۔ اس سے اس دور کے نصاب کا اندازہ ہو سکتا ہے:

"اگرچہ فارسی علوم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سب کا احاطہ کرنا کسی بشر کے لئے ممکن نہیں ہے۔ آغاز میں برکت کے لئے گلستاں، بوستان، رقعاتِ ملا جامی نہایت ضروری ہیں اور جب مزید توفیق ملے تو کتبِ اخلاق، اخلاقِ جلالی، اخلاق ناصری وغیرہ اور کتبِ تاریخ، حبیب السیر، روضۃ الصفا، روضۃ السلاطین، تاریخ گزیدہ، تاریخ طبری، ظفر نامہ، اکبر نامہ وغیرہ کا پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ ان سے سنجیدگی اور متانت پیدا ہوتی ہے اور دنیا اور دنیا والوں کے حالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، محفلوں اور مجلسوں میں ان کی ضرورت پیش آتی ہے۔ شعراء کے دواوین اور مثنویاں جو اس نیاز مند نے عنفوانِ شباب میں پڑھی تھیں وہ یہ ہیں: حدیقہ حکیم سنائی، مثنوی مولانا روم، منطق الطیر خواجہ فرید الدین عطار، دیوان شمس تبریز وغیرہ۔

اے فرزند! جس قدر فرصت میسر آئے ان بزرگوں کی تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ برکت اور راحت حاصل ہو، تاکہ لیاقت اور قابلیت پیدا ہو، تاکہ کلام میں لذت حاصل ہو۔"

فارسی نصاب سات سالہ تھا اور سات مضامین کی کتابیں داخلِ نصاب ہوتی تھیں:

۱۔ تحصیل فارسی، ۲۔ فارسی ادب، نثر اور شاعری، ۳۔ عقائد اور عبادات، ۴۔ اخلاق و تصوف، ۵۔ تاریخ و واقعات، ۶۔ حکمت و دانائی، ۷۔ انشاءات اور رقعات۔

کل کتابیں ۶۴ ہوتی تھیں۔ تکمیل کی کتابیں اس کے علاوہ ہوتی تھیں۔

اصولِ نصاب سازی

کتابوں کا تذکرہ کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ

چاہیے۔ بیان کیا جائے کہ قدماء کے نزدیک نصاب سازی کے اصول کیا تھے۔ چھوٹے بچوں کے اندر تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنا اور ان کے لئے درسی کتابیں تیار کرنا فن تدریس کا ایک دشوار مسئلہ ہے۔ اہل مغرب نے تو اپنی توجہ اس امر پر مرکوز کر دی کہ بچے مادی محسوس اشیاء میں دلچسپی لیتے ہیں اس لئے انھوں نے بچوں کی کتابوں کو تصویروں سے آراستہ کرنا شروع کر دیا۔ کتاب کے مضامین کا تعلق بھی محسوس مادی اشیاء سے رکھا ہے تاکہ بچے ان کو شوق سے پڑھیں اور آسانی سے یاد کریں۔ مگر بچوں کی ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ بچوں کا حافظہ بڑا قوی ہوتا ہے اور بعض دفعہ بے معنی بول بھی دہراتے رہتے ہیں۔ ہمارے مسلمان ماہرین تعلیم نے اپنی توجہ بچوں کی اس نفسیاتی کیفیت پر مرکوز کر دی۔ انھوں نے بچوں کے لئے نہایت آسان زبان میں اور حد درجہ رواں اشعار میں درسی کتابیں لکھیں۔ مسلمان ماہرین تعلیم بچوں کو اخلاق کی تعلیم دیتے تھے اور ان کے اندر اخلاقی ملکات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ بچوں کو نصابی کتابوں میں اور ان اشعار میں اخلاق محمودہ اور اخلاق ذمیمہ کی تعلیم دیتے تھے۔ بچپن میں جو بات ذہن نشین ہو جاتی ہے وہ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ اس طریقہ کار میں بڑی حکمتیں اور فوائد ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اخلاقی پند و نصائح کا سرمایہ بچے کے ذہن میں محفوظ ہو جاتا تھا جو زندگی بھر اس کو کام دیتا تھا۔ حالات کا جیسا تقاضا ہوتا، صورت حال جس قسم کی پیش نظر ہوتی اسی قسم کے اشعار وہ شخص اپنے حافظے سے محفل میں، درباروں میں، ایوان حکومت میں دہرا دیتا تھا۔ یہ اشعار زندگی کی پیچیدہ راہوں میں اخلاقی فیصلہ کرنے پر آمادہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتے تھے۔ گویا ان کے ذہن میں اخلاقی کتاب حوالہ محفوظ تھی۔

مثلاً کریما کے چند اشعار یہ ہیں جو آدمی دہراتا رہتا تھا: جہالت کے خلاف ؎

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت ، لالچ کے خلاف ؎ طمع را سہ حرف است ہر سہ تہی ،

کنجوسی کے خلاف ؎ بخیل ار بود مالک بحر و بر ، بہشتی نباشد بحکم خبر ،

خودداری سے عاری دولت مند کے خلاف ؎

..... گدا گر تونگر بود ۔ صد سال از و بوئے گدائی نرود ، وغیرہ

دوسرا فائدہ بچے کے نقطہ نظر سے یہ تھا کہ وہ ان اشعار کو بلند آواز میں جھوم جھوم کر

پڑھتا تھا، نہ وہ تھکتا تھا نہ طبیعت کند ہوتی تھی۔ ذوق و شوق بدستور قائم رہتا تھا۔ تیسرا فائدہ یہ تھا کہ بچہ اپنے سبق سے خوش ہوتا تھا گھر آکر شوق سے سبق دہراتا تھا۔ والدین کو سناتا تھا، وہ بھی بچے کی خوشی میں شریک ہوتے تھے گویا عملِ تعلیم میں بچے کے ساتھ پورا ماحول، استاد، والدین سب شریک ہو جاتے تھے۔ آج کا بچہ کتے اور بلی کا سبق پڑھ کر آتا ہے، نہ وہ سناتا ہے اور نہ سننے والوں کو مزہ آتا ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اشعار پڑھتے پڑھتے بچے کے اندر شعر کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح چھوٹی سی عمر ہی سے اس کے اندر ذوقِ لطیف کی آبیاری ہوتی رہتی تھی۔ ہر پڑھے لکھے شخص کے اندر شعر گوئی نہیں تو شعر فہمی کا شستہ ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کا ذوقِ شعری ضرب المثل تھا۔ اس کی آبیاری اسی تعلیم سے ہوتی تھی۔

اوپر مذکور ہوا ہے کہ یہ نصاب تعلیم سات سالہ تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نصاب سالوں کے بجائے کتابوں سے وابستہ تھا۔ بعض طلبہ سات سالوں میں اس نصاب کو ختم کر لیتے تھے بعض جلدی ختم کر لیتے تھے، بعض مزید تاخیر سے ختم کر پاتے تھے۔ اصل اہمیت کتابوں کی تھی۔

چند اوراق کے چھوٹے چھوٹے رسالے شاملِ نصاب ہوتے تھے جو جلدی جلدی ختم ہو جاتے تھے اور بچے کا شوق تازہ رہتا تھا۔ نئی کتاب شروع کرنے پر بچے کو خوشی ہوتی تھی۔

نفسیاتِ اطفال کے ماہرین آج بتاتے ہیں کہ وقت کا تصور بچے کے نزدیک بالغ انسان کے تصورِ وقت سے تیز رفتار ہوتا ہے۔ جلد جلد، نئی نئی اشیاء اس کے سامنے سے گزرتی رہنی چاہئیں۔ طویل گھنٹوں سے اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ ہمارے قدیم بزرگوں کو بچوں کی نفسیات کا یہ گُر معلوم تھا۔ اس کے مطابق ہی انھوں نے بچوں کی نصابی کتب تیار کیں جو عام طور پر دس پندرہ دن میں ختم ہو جاتی تھیں۔

کتبِ تدریس

برصغیر ہند و پاکستان کے لوگوں کے لیے فارسی غیر ملکی زبان تھی اس لیے تعلیم کا پہلا مرحلہ زبان کی تحصیل تھا۔ اس میں اصولِ تدریج کو سامنے رکھ کر کتابیں تیار کی گئی تھیں۔ سب سے اول بچوں کے لیے

امیر خسرو سے منسوب کتاب خالق باری پڑھائی جاتی تھی جس میں عام طور پر استعمال ہونے والے فارسی، عربی اور ہندی کے الفاظ جمع کر دیئے گئے تھے۔ یہ کتاب اشعار میں ہے۔ ؎

خالق باری سرجن ہار   واحد ایک بدا کرتار

تحصیلِ فارسی کے لئے قواعد وغیرہ کی اچھی خاصی تعداد میں کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں۔

تحصیل کے بعد ضروری تھا کہ فارسی زبان میں مہارت حاصل ہو، تحریر و تقریر پر قدرت حاصل ہو۔ اس کے لئے نثر اور نظم کی ایک معقول تعداد کتب پڑھنی پڑتی تھیں۔ اس کے بعد عام طور پر وہ طالب علم فارسی تحریر و تقریر پر رواں ہو جاتا تھا یعنی لوگوں کی تحریریں بڑی معیاری ہوتی تھیں۔ اہلِ ہند کے فارسی نثر و نظم میں چھوڑے ہوئے آثار اہلِ زبان سے خراجِ تحسین وصول کرتے ہیں۔ نظم میں امیر خسرو، فیضی اور غالب کا کلام اور نثر میں ابو الفضل اور عنایت اللہ لاہوری کی نگارشات کو اہلِ ایران بھی تسلیم کرتے تھے حالانکہ ان لوگوں کی مادری زبان فارسی نہیں تھی۔ انگریزی زبان سے مقابلہ کر کے دیکھئے، ڈیڑھ سو سال کی مدت میں ایک بھی ایسا ادیب اور شاعر پیدا نہیں ہوا جس کو اہلِ زبان انگریز بھی تسلیم کرتے ہوں جس کی انگریزی کو معیاری مانتے ہوں۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ قدیم مدارس کے اصولِ تدریس زیادہ صحیح تھے وہ زیادہ کامیاب رہے۔

اس نصاب میں ایک حصہ عقائد و عبادات سے متعلق تھا۔ اس کی ضرورت اس لئے تھی کہ آغاز ہی سے بچے کا ذہن اسلامی خطوط پر استوار ہو۔ یہ ایک بنیادی ضرورت تھی۔ دینی تعلیم کے ذیل میں اخلاق و تصوف کے زیرِ عنوان کتابوں کا ایک سلسلہ تھا جو طالب علم پڑھتا تھا۔ آسان سی کتابیں، نام حق سے یہ سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ کریما، پند نامہ عطار، تحفۃ الاحرار جامی اور مثنوی مولانا روم تک وسیع تھا۔ اس لئے کہ صرف مسائل خشک انداز میں جان لینا ہی کافی نہیں ہے۔ مسلمان وہ ہے جس کی ذہنیت اور جس کی فکر مسلمان ہو چکی ہو۔ جس کے غور و فکر کا نہج اور رخ متعین ہو چکا ہو۔ تشکیلِ ذہنیت کا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ سادہ انداز میں خشک طریقے سے عقائد گنوا دینے سے یا مسائل بیان کر دینے سے ذہنیت تشکیل پذیر نہیں ہوتی بلکہ آیاتِ قرآنی اور احادیث کے ترجمے، سبق آموز حکایات

اور قصے، پند و نصائح، اشعار، سب مل کر ذہن کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر اس کو استحکام بخشتے ہیں۔ اس کے بعد کتبِ اخلاق اور کتبِ فہمِ معاملات پڑھائی جاتی تھیں۔ اس میں اخلاقِ محسنی، اخلاقِ ناصری اور اخلاقِ جلالی شامل تھیں۔ ان کتب سے دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کے معاملات پر گفتگو کی جاتی تھی۔ انسانی زندگی کو ان کتابوں میں چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: تہذیبِ اخلاق (تدبیرِ فرد)، حسنِ معاشرت: تدبیرِ منزل (افرادِ خاندان کے معاملات)، تدبیرِ مدن (شہری زندگی کے معاملات) اور تدبیرِ ریاست و حکومت۔ ان شعبوں میں ہمارے جدید دور کے بہت سے عمرانی علوم کا بیان آجاتا ہے مثلاً عمرانیات، اقتصادیات، سیاست اور سب سے بڑھ کر اخلاق اور حکمت و دانائی کا بیان ہوتا تھا۔[1] ان علوم پر مختلف نقطۂ نظر سے گفتگو کی جاتی تھی، مختلف فاضل ترین افراد کے نکاتِ علمیہ ان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔ اس طرح دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے انفرادی اور اجتماعی معاملات کو حل کرنے اور چلانے کی صلاحیت طلبہ میں پیدا ہو جاتی تھی۔

فارسی نصاب کا قابلِ قدر اور اہم ترین حصہ انشاءات اور رقعات کی تعلیم پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ اس نصاب کا امتیازی حصہ تھا۔ لوگ خطوط سمجھ کر ان کو لائقِ توجہ نہیں سمجھتے۔ ان رقعات کا کسی شخص نے سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا نہ ان کے پس پردہ حکمت و دانائی کو واضح کیا رقعات کی خاصی طویل فہرست ہے جو فارسی کے طلبہ مطالعہ کرتے تھے مثلاً رقعاتِ قتیل، انشائے دلکشا، انشائے فائق، انشائے بہارِ عجم، انشائے خلیفہ، امان اللہ حسینی، رقعاتِ عالمگیری، انشائے منیر، انشائے مادھورام، انشائے فیض رساں، رقعاتِ بیدل، پنج رقعات (ارادت خاں)، رقعاتِ ابوالفضل، انشائے طاہر وحید، انشائے طغریٰ وغیرہ۔

مغل دورِ حکومت کے ارکانِ سلاطین اور نوابین ہوں یا صوبوں کے امراء ہوں یا اضلاع کے والی ہوں، سب کے یہاں سرکاری مراسلت کے لئے دفتر قائم ہوتا تھا۔ مراسلت لکھنے والے منشی یا دبیر ہوتے تھے۔ جس قسم کی بھی تحریرات ہوتیں اور رقعات لکھے جاتے ان سب کی

---

[1] مغرب میں معاشرتی علوم، اخلاق اور دین سے عاری کرکے پڑھائے جاتے ہیں۔

نقول دفتر میں رکھی جاتی تھیں۔ پھر وہ منشی اپنے قلم کی لکھی ہوئی تمام تحریرات کی نقلوں کو جمع کرکے شائع کر دیتا تھا۔ یہ دراصل ان امراء، نوابین اور والیوں کی مراسلت اور احکام ہوتے تھے جو منشی اپنے نام سے شائع کرتے تھے۔ انشائے بہارِ عجم کے معنی یہ ہیں کہ منشی ٹیک چند بہار نے اپنے حاکم اور آقا کے لئے جو خطوط لکھے، جو مراسلت کی، یہ ان سب کا مجموعہ ہے۔ مادھو رام، فائق، خلیفہ، امان اللہ حسینی یہ سب منشیوں کے نام ہیں جنھوں نے یہ مکاتیب کے مجموعے تیار کئے ہیں۔

یہ خطوط سکھاتے تھے کہ مختلف مواقع کے لئے اور مختلف مقاصد کے لئے کس قسم کی تحریریں اور نگارشات لکھی جاتی تھیں۔ نجی خطوط، اعتذار و معذرت نامے، سپاس گزاری اور سپاس نامے کس طرح لکھے جاتے تھے۔ سرکاری مراسلت اور قانونی دستاویزات کس طرح تیار کی جاتی تھیں۔ پھر یہ خطوط مختلف اسالیبِ بیان سکھاتے تھے قوتِ استدلال اور زورِ بیان سکھاتے تھے۔ ان میں رقعاتِ ابوالفضل بھی ہیں جو اکبر بادشاہ کا وزیر تھا اور مشہور اہلِ قلم اور انشاء پرداز تھا۔ اس کے زورِ بیان کی قوت اس کے دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ بلخ کے حکمران نذر محمد نے ایک بار کہا تھا: میں اکبر کے سپہ سالار خانخاناں کی تلوار سے اتنا خائف نہیں ہوں جتنا ابوالفضل کے قلم سے خائف ہوں۔ یہ خطوط معذرت اور معافی کا انداز سکھاتے تھے۔ دفتری امور میں یہ خطوط حساب و کتاب، سیاق نویسی، تخمینۂ آمد و خرچ اور محاسبہ سازی امور کی تعلیم دیتے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ان خطوط سے نجی زندگی کا حال معلوم ہوتا تھا۔ یہ مغل دور کی انتظامیہ پر فائز افراد کے خطوط ہیں اس سے ان کی نجی زندگی عیاں ہو جاتی تھی یعنی وہ کس قدر با اخلاق اور متقی تھے۔ کس حد تک عدل و انصاف کا پاس و لحاظ رکھتے تھے یا کہ وہ بد اخلاق اور بد عہد تھے۔ مغل انتظامیہ کا یہ آئینہ ہے۔ اصل زندگی کے واقعات یہاں عریاں نظر آتے ہیں۔

یہ خطوط اپنے سے بالا حکام اور افسروں کے نام ہیں، اپنے برابر والوں کے نام ہیں، اور اپنے زیر دستوں کے نام ہیں اور اپنے اعزہ و اقرباء کے نام ہیں۔ ان خطوط میں سرکاری رپورٹیں، ضابطے، ہدایت نامے، احکام، مالی امور، آمد و خرچ کے تخمینے سب شامل ہیں

ان میں صلح و جنگ، ناراضگی اور معافی، اعتذار و معذرت، عذر خواہی اور تعزیت، سپاس گزاری اور توصیف، شعراء کے کلام پر تقریظیں، خانگی امور پر مشورے، ہر قسم کے معاملات درج ہیں۔ ان خطوط میں ضرب الامثال بیان کی گئی ہیں، موقع و محل کی مناسبت سے اشعار بیان کئے گئے ہیں، مناسب حکایات بیان کی گئی ہیں، واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے، حکما کے مقولے درج کئے گئے ہیں، احادیث اور آیات قرآن کا ذکر ہے۔ یہ خطوط مغل امراء اور نوابین اور والیان ممالک کے کردار و گفتار کے آئینہ دار ہیں اور ان سے ان کے انداز فکر اور وسیع علم کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور ان سے ان کی نجی اور شخصی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

طومار خوانی کی تعلیم

مکاتیب کے نصاب کا ایک اہم حصہ طومار خوانی ہوتا تھا۔ قدیم زمانہ میں ہر قسم کی تحریر قلم سے لکھی جاتی تھی۔ شاہی فرامین تو خط نستعلیق میں خوشخط لکھے جاتے تھے ورنہ دوسری تمام تحریریں جن میں نہ نقطے ہوتے تھے نہ حروف کی صحیح شکلیں ہوتی تھیں خط شکست میں لکھی جاتی تھیں جن کا پڑھنا بہت مشکل ہوتا تھا اس لئے ہر قسم کی شکستہ تحریر پڑھنے کا سلیقہ طومار خوانی کے ذریعہ طلبہ کو سکھایا جاتا تھا۔ ان کے مطالعہ سے یک ملکہ پیدا ہو جاتا تھا۔

مختلف منشیوں کے لکھے ہوئے بہت سارے خطوط کو جوڑ کر لمبا سا ایک تختہ بنا لیتے تھے اور پھر اس کو گول گول لپیٹ کر رکھتے تھے اس کو طومار کہتے تھے۔ اس طومار میں مختلف ہاتھوں کے مختلف طرز کے لکھے ہوئے خطوط جمع ہوتے تھے۔ طلبہ سے ان کو پڑھنے کی مشق کرائی جاتی تھی تاکہ وہ ہر قسم کی سرکاری دستاویزات کو آسانی سے پڑھ سکیں۔

سیاق نویسی (حساب لکھنا) میں بھی ارقام عربی سکھائے جاتے تھے تاکہ غیر متعلق شخص ان اعداد کو نہ سمجھ سکے۔ صرف منشی ہی پڑھ سکتے تھے۔

مغلیہ دور کی سول سروس کی تعلیم

امور سلطنت و نظام حکومت کی تعلیم و تربیت دینے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک نظری اور دوسرا عملی۔ نظری تعلیم یہ ہے کہ سیاست و حکومت، جنگ و صلح پر باقاعدہ تصنیف شدہ کتابیں طالب علموں کو اور امیدواروں کو پڑھائی جائیں۔ لیکچر دیئے جائیں۔ نظری طریقے

سکھلائے جائیں، قواعد و ضوابط بتلائے جائیں، حقائق کو اصولی انداز میں اور تجریدی انداز میں پڑھایا جائے۔ یہ طریقہ ہمارے زمانہ میں رائج ہے۔ اعلیٰ درسگاہوں یا فنی درسگاہوں سب میں یہی طریقہ رائج ہے۔ دوسرا طریقہ عملی ہے۔ ایک انسان کو امور سیاست و حکومت میں جن مسائل سے سابقہ پڑتا ہے اور جس طرح ایک شخص ان کو حل کرتا۔ ان امور کو ان کے فطری پس منظر میں دکھا کر سمجھایا جائے۔ یہ انشاءات و رقعات، سرکاری خطوط اور سرکاری مراسلات، سرکاری احکام و دستاویزات، اس منظر کو پیش کرتے ہیں جن کو پڑھ کر ایک طالب علم پہلے مسئلہ کی سنگینی اور دشواری کو سمجھتا تھا پھر جو حل اختیار کیا گیا اس کو سمجھتا تھا۔ اس طرح اس کی تربیت عملی انداز میں ہوتی تھی۔ ایک امیر کی ساری مراسلت اور تحریرات اس طالب علم کے سامنے سے گزر گئیں یا اس امیر کا سارا طرز عمل، سارا کردار، ساری حکمت عملی سب عیاں ہو کر سامنے آگئی۔ اس طرح دس بارہ رقعات کے مجموعے پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ دس بارہ اعلیٰ مناصب پر فائز امراء کے کردار سامنے آگئے۔ حکومت کے لئے اہل کاروں اور افسران کی تعلیم و تربیت کا یہ ایک نہایت اچھا طریقہ تھا اس طرح فطری انداز میں تربیت دی جاتی تھی۔ ہمارے زمانہ میں نیپا کی تربیت سے اس کو تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

اس نصاب کی اہمیت

دراصل یہ مغل دور حکومت میں سول سروس کی تعلیم و تربیت کا نصاب تھا۔ نصاب تعلیم کا یہ فارسی حصہ تھا جس سے معاملہ فہم، کاروان اور امور مملکت سے واقف لوگ پیدا ہوئے۔ اس نصاب کو پڑھ کر ایک طالب علم حکومت کے اعلیٰ ترین منصب کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ بڑی سے بڑی ذمہ داری پورا کرنے کا اہل بن جاتا تھا۔ یہ نصاب حکومت وقت کو مردان کار مہیا کرتا تھا۔ اس نصاب کو پڑھ کر   کے ایک ملا کا بیٹا نواب سعد اللہ خان شاہ جہان بادشاہ کا وزیر اعظم بن گیا تھا۔ ایسا وزیر اعظم جس کا شمار عالم اسلام کے چوٹی کے وزراء میں ہوتا ہے، جس کا شمار نظام الملک طوسی، نصیر الدین محقق طوسی اور محمود گاواں کے زمرہ میں ہوتا ہے۔

اس نصاب تعلیم نے گزشتہ زمانہ میں جیسے لائق اور فائق افراد پیدا کئے مثلاً سعد اللہ خان وزیر اعظم، عبدالرحیم خان خاناں سپہ سالار، ابو الفضل وزیر اعظم، منعم خان گورنر، علی مردان

خاں مہندس معمار شالامار باغ لاہور اور نہر چاندنی چوک دہلی، استاد احمد لاہوری معمار روضۂ تاج محل آگرہ و جامع مسجد دہلی، خیر اللہ خاں دہلوی، ماہر فلکیات، مہندس زیچ محمد شاہی و جنتر منتر نئی دہلی، عبدالقادر بدایونی مورخ، احمد معین رازی جغرافیہ داں، علامہ تفضل حسین کاشمیری لکھنوی، ہفت زبان، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، یونانی، لاطینی۔

ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوئی (۱۸۵۷ - ۱۷۵۷ء) اس وقت تک مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت پوری طرح کارفرما تھا۔ اس سے مردانِ کار تیار ہو رہے تھے۔ بعض انگریز مصنفوں نے مسلمانوں کی حسنِ لیاقت اور حسنِ کارکردگی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ولیم ہنٹر لکھتا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان یہاں سب سے اعلیٰ قوم تھی، نہ صرف جرأت اور قوتِ بازو میں برتری رکھتی تھی بلکہ سیاسی تنظیم اور عملی سیاست میں بھی۔"

(P.145 INDIAN MUSLMAN)

ایک دوسرا انگریز ہنری ہیرنگٹن لکھتا ہے:

"عزم و ہمت، تعلیم اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں۔ ہندو ان کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں مسلمانوں میں کارگزاری کی اہلیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں زیادہ تر انہی کو ملتی ہیں۔"

(INDIAN REBELLION AND OUR POLICY BY HENRY HERRINGTON THOMAS 1857, P-135)

ہمارے نصاب میں مردم سازی کی بڑی عظیم الشان صلاحیت تھی۔ اس سے جامع الصفات قسم کے افراد پیدا ہوتے تھے۔ آخر زمانہ تک جامع حیثیت کے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ سر سید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے جامع حیثیت کے لوگ تھے جو مختلف علوم پر یکساں قدرت کے ساتھ قلم اٹھاتے تھے۔ اس کے برخلاف آج جس کو بھی دیکھو وہ یک رخا نظر آتا ہے۔

مغربی علوم سے واقفیت کی کوشش

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"حکمت کی بات مومن کا گمشدہ مال ہے۔ جہاں کہیں بھی اسے پائے اٹھا لے۔" اس حکم کی پیروی میں مسلمانوں نے دنیاوی علوم کی تحصیل میں نہ کوتاہی برتی اور نہ کسی تعصب میں مبتلا ہوئے۔ ماضی میں مسلمانوں نے یونانی، ایرانی اور ہندی علوم سیکھے اور ان کو اپنا لیا۔ اسی تاریخی روایت کے زیرِ اثر اہلِ مغرب کے علوم و فنون سیکھنے میں بھی مسلمانوں نے پہل کی حالانکہ اس زمانہ میں اہلِ مغرب یعنی اہلِ پرتگال کی علمی حالت اور اخلاقی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ عام طور پر وہ میلوں ٹھیلوں میں تماشے دکھاتے تھے اور بازی گر کہلاتے تھے۔ مجدد الف ثانی نے ایک مکتوب کے اندر جاہل بھوڑ فرنگیوں کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے۔

بحیثیت افراد مسلمانوں نے مغربی زبانیں سیکھیں اور مغربی علوم سے تعارف حاصل کیا اور بعض نے ان کے ترجمے بھی کئے۔ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں گجرات کے صوبہ دار عبدالستار قاسم نے "پادریان گوا" سے مل کر لاطینی زبان حاصل کی اور پھر فلسفۂ یونان پر ایک کتاب لکھی جس کا نام ثمرۃ الفلاسفہ تھا۔ محمد حسین آزاد نے اپنی روپوشی کے زمانہ میں خلیفہ محمد حسین پٹیالہ کے کتب خانہ میں اس کو دیکھا تھا۔[1] عہد عالمگیری کے ایک امیر معتمد خاں بن رستم خاں بدخشی نے حصولِ علم کی خاطر دار السلطنت پرتگال کا سفر اختیار کیا اور وہاں ریاضی کی ایک کتاب CLAVIOUS ON GNOMONICS کا براہ راست لاطینی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ علامہ تفضل حسین کاشمیری سلطنت اودھ کی جانب سے کلکتہ میں سفیر تھے۔ وہاں انھوں نے یورپ کی کئی زبانیں سیکھی تھیں۔ وہ ہفت زبان تھے۔ انھوں نے علمِ ہندسہ، مخروطات، جرِ ثقیل اور لوگارتھم پر کتابیں لکھی ہیں۔ اسحاق نیوٹن کی مشہور کتاب PRINCIPIA کو لاطینی سے عربی میں ترجمہ کیا۔[2] حکیم اظہر علی خاں دہلوی نے مرض فیل پا یا ELEPHANTASIS پر انگریزی زبان میں بڑا پر از معلومات مضمون لکھا جو جرنل آف لندن میں ۱۷۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔[3] کسی ہندوستانی مسلمان کی یہ سب سے اوّل

[3] انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ۔ علامہ عبداللہ یوسف علی... ص ۱۲۳

[1] دربارِ اکبری۔ محمد حسین آزاد۔ ممکن ہے اب یہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہو۔

انگریزی تحریر تھی جس کا علم ہو سکا ہے۔ مغربی علوم کے سلسلہ میں سب بڑا نام مولوی عبد القادر بن خیر اللہ جونپوری (۱۷۸۷ء/۱۲۰۲ – ۱۲۴۰ء) کا ہے۔ مسلمان مغربی علوم سے اس وقت اس قدر شناسا ہو گئے تھے کہ اب ان پر تنقید کرنے لگے تھے اور اس کا موازنہ اپنے علوم سے کرنے لگے تھے۔ مولوی عبد القادر کی لکھی ہوئی اس سلسلہ کی دو کتابوں کا علم ہو سکا ہے۔ پہلی کتاب میں انھوں نے مغرب کے مشہور فلسفی فرانسس بیکن (۱۵۶۰ – ۱۶۲۶ء) پر تنقید لکھی ہے اس کتاب کا نام ہے التعقب علی باکون المغربی اور دوسری کتاب میں انھوں نے مشرقی اور مغربی فلسفہ کا محاکمہ کیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے محاکمہ بین العلوم المشرقیہ والمغربیہ[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی علوم پر عبد القادر جونپوری کو کس قدر دسترس حاصل تھی۔

انفرادی مطالعہ اور ترجمہ کا سلسلہ بڑا طویل ہے۔ اس میں مسلمانوں کے ساتھ بعض انگریز اور ہندو بھی شریک تھے۔ جان ٹیلر، فورٹ ولیم کالج میں استاد تھا۔ اس نے طب کی ایک کتاب کا ترجمہ اردو (کذا) ۱۸۲۱ء میں کیا تھا[2] اودھ کے وزیر اعظم فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ زخمی نے ۱۸۰۵ء میں بعض مغربی علوم کے تراجم کئے تھے اس کا نام تھا حدائق النجوم۔ عبد القادر بن غلام نبی تحصیل دار علوم مغربی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ انگریزی زبان وہ اتنی اچھی جانتے تھے کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت قائم کردہ ایک دینی مدرسہ تھا (۱۷۸۱ء)، اس میں انگریزی زبان کے استاد مقرر ہوئے تھے[3] ابو القاسم محمد حسین جونپوری نے سائنس کے رسائل کا ترجمہ کیا تھا۔ اس مجموعہ کا نام مجموعہ بہادر خانی ہے۔ اس میں فلکیات، بصریات، ریاضی، لوگارتھم، مماس المناظر وغیرہ رسائل شامل تھے۔ حکیم نصیر الدین نے موویٹ "MOVAT" کی جراحی کی کتاب کا اردو ترجمہ کیا تھا جو معین الجراحین کے نام سے مشہور تھا۔ مولوی محمد احسن نانوتوی نے دہلی کالج میں مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے جر ثقیل

۱۔ حدیقۃ المرام (عربی)، از شیخ محمد واصف، طبع مدراس ۱۲۷۵ھ

۲۔ " " " " " ص ۱۰۷

۳۔ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، از حکیم سید عبد الحی لکھنوی

پر ایک رسالہ لکھا تھا۔

ترجمہ کے لئے بعض اجتماعی ادارے بھی کوشاں ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام تو سلطان ابو الفتح ٹیپو شہید کا آتا ہے۔ انھوں نے جدید طرز کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس کا نام رکھا تھا جمیع الامور (غالباً یہ یونیورسٹی کا ترجمہ کیا گیا تھا) اس میں بعض فرانسیسی اور ترک بطور معلم مقرر تھے۔ مرزا محمد نصیر شاد ترک نے یہاں کئی مغربی علوم کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا[1]

قدیم روایات کے مطابق ایک انگریزی مدرسہ کی سلطان حیدر علی نے امداد کی تھی[2] نواب غازی الدین والی اودھ کو بھی انگریزی علوم سے دلچسپی تھی۔ ان کو انجینئرنگ کے شعبہ سے دلچسپی تھی۔ کلول (مشین) اور دخانی انجنوں پر وہ تجربہ کرتے تھے۔ مغربی علوم کے تراجم کی سب سے زیادہ کوشش حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ شمس الامراء میر کبیر نواب فخر الدین خاں (۱۸۶۳ء – ۱۸۰۰ء) نے ترجمہ کے لئے ایک باقاعدہ ادارہ قائم کیا تھا۔ اس میں مترجموں کو جمع کیا گیا تھا۔ یہ مغربی علوم کی کتابوں کا عربی اور کبھی اردو میں بھی ترجمہ کرتے تھے۔ ان کتابوں کی اشاعت کے لئے نواب نے ایک مطبع قائم کیا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں شمس الہندسہ شائع ہوئی۔ اس میں علم الماء، علم الہوا، علم الانظار، علم البرق وغیرہ رسائل شامل تھے[3]

ترجمہ کا کام دہلی کالج میں ہوا۔ کالج کے استاد بطرس (BUTROS) اور اسپرنگر نے مل کر ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کا نام تھا (VERNACULAR TRANSLATION SOCIETY)۔ یہ سوسائٹی ۱۸۴۰ء میں قائم ہوئی[4] اس میں سائنس، تاریخ اور ریاضی کی کتابوں کا ترجمہ ہوا تھا ان کو سوسائٹی نے ہی طبع کرایا تھا۔ اس قسم کا ایک ادارہ نوابانِ اودھ نے ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں

۱۔ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، از حکیم سید عبد الحی لکھنوی

۲۔ تاریخ سلطنت خداداد میسور، از محمود بنگلوری، ص ۳۹۴

۳۔ تاریخ التعلیم، از حامی الدین خاں، ص ۱۲۹ تا ۱۳۰

۴۔ مرحوم دہلی کالج، از مولوی عبد الحق

قائم کیا تھا جس کا سربراہ کمال الدین حیدر آبادی تھا۔ اس نے علم الہیئت، علم الطبیعۃ، علم قوۃ المقناطیسیہ، علم فی الآلات الرصدیہ۔ یہ پندرہ کے قریب رسالے تھے جو اس ادارہ نے شائع کئے تھے۔[1] اس موضوع پر مزید معلومات کے لئے مصنف کی کتاب "مسلمان اور مغربی تعلیم" کا مطالعہ مفید رہے گا۔

دوسرے مسلمان ممالک کے علماء نے بھی مغربی علوم اور خاص طور پر سائنسی علوم کی تحصیل کی کوشش کی۔ ۱۷۹۹ء میں عثمانی خلیفہ سلیم ثالث نے مغربی علوم، الجبرا، علم مثلث، طبعیات، علم میکانکی کو ملک میں رواج دینے کی کوشش کی۔ اس غرض کے لئے سویڈن اور فرانس سے ماہر اساتذہ کو ترکی میں بلایا تھا۔ محمد علی البانوی سلطانِ مصر نے ۱۸۲۰ء میں مصری طالب علموں کا ایک وفد فرانس بھیجا تھا تاکہ وہ معدنیات اور کان کنی کی تعلیم حاصل کریں۔

بعض انگریز مصنفین کو بھی اعتراف ہے کہ مسلمان انگریزی زبان اور مغربی علوم سیکھنے کے خواہش مند تھے اور جہاں کہیں حالات سازگار ملتے ہیں وہ ان کو حاصل کرتے ہیں۔

ایک انگریز پادری بشپ ہیبر نے اپنے سفرنامہ (۱۸۲۳ـــ۱۸۲۶ء) میں صراحت سے لکھا ہے۔ "ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا ہم سے نفرت کرنا قابلِ فہم ہے لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان کے اندر انگریزی زبان سیکھنے اور انگریزی اوضاع و اطوار اختیار کرنے کا زبردست جذبہ پایا جاتا ہے۔"[2]

قدیم نظامِ تعلیم پر مولانا مودودیؒ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاں تک پرانے نظامِ تعلیم کا تعلق ہے وہ آج سے صدیوں پہلے کی بنیادوں پر قائم ہے۔ جس وقت یہاں انگریزی حکومت آئی اور انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے اس وقت جو نظامِ تعلیم ہمارے ملک میں رائج تھا وہ ہماری اس وقت کی

۱؎ اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں۔ از حکیم سید عبدالحی

۲؎ NARRTIVE OF بحوالہ BRITISH POLICY IN INDIA P-182

ضروریات کے لئے کافی تھا۔ اس نظام میں وہ ساری چیزیں پڑھائی جاتی تھیں جو اس وقت کے نظامِ حکومت کو چلانے کے لئے درکار تھیں۔ اس میں صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں تھی بلکہ اس میں فلسفہ بھی تھا، اس میں ریاضی بھی تھی، اس میں ادب بھی تھا اور دوسری چیزیں بھی تھیں۔ اس زمانہ کی سول سروس کے لئے جس طرح کے علوم درکار تھے وہ سب طلبہ کو پڑھائے جاتے تھے۔"

(تعلیمات: ص ۱۳۰)

انگریزی حکومت کی معاندانہ روش

یہ تفصیل جان کر بعض لوگوں کے دل میں ضرور سوال پیدا ہوگا کہ ایسے فاضل لوگ پیدا ہونے کیوں بند ہوگئے۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ "زوالِ حکومت اور انگریز حکومت کی معاندانہ روش۔"

انگریزوں نے سلطنت مسلمانوں سے حاصل کی تھی۔ اگر بغاوت کا اندیشہ ہوسکتا تھا تو وہ مسلمانوں کی طرف سے ہوسکتا تھا۔ لارڈ ایلن بارو ۸ جنوری ۱۸۴۳ء کے خط میں لارڈ ولنگٹن کو لکھتا ہے:

"میں اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا کہ یہ نسل (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے، اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کو خوش کیا جائے۔"

(UN HAPPY INDIA — BY LALA LAJPAT RAI — P: 400)

اس لئے انگریزی حکومت کی مشینری نے مسلمانوں کو معاشرہ میں پست، ذلیل اور ناکارہ بنانے کے لئے ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا۔ جس کے اہم اجزاء تین تھے۔

۱۔ مسلمانوں کو مفلس و قلاش بنا دیا جائے۔ ان کا سارا وقت دو وقت کی روٹی حاصل کرنے میں صرف ہوجائے۔ مذہب و سیاست، ملک و ملت کے اعلیٰ تصورات ان کے ذہن سے محو ہوجائیں۔

۲۔ مسلمانوں کو جاہل اور پسماندہ بنا دیا جائے۔ قانون بازیافت RESUMPTION ACT 1828 کے ذریعہ برصغیر میں سارے اوقاف پر حکومت نے قبضہ کرلیا۔ اس طرح تمام دینی مدارس کے سرچشمے سوکھ گئے، مدارس بند ہوگئے مزید برآں دینی تعلیم کے خلاف اور علماء کے خلاف

پروپیگنڈہ کرکے یہ فضا پیدا کر دی تاکہ کوئی صاحب حیثیت خاندان کا فرد ادھر کا رخ ہی نہ کرے۔

۳۔ جدید مغربی تعلیم کا ڈھانچہ، ہندوؤں، عیسائی مشنریوں کی مرضی کے مطابق تیار کیا گیا اور مسلمانوں کو دیدہ و دانستہ پیچھے دھکیلا گیا تاکہ وہ آگے نہ بڑھیں۔ اور اس بات کو شہرت دے دی کہ مسلمان علماء نے انگریزی کے خلاف فتویٰ دے دیا ہے حالانکہ ڈیڑھ صدی گزر گئی آج تک کسی نے وہ فتویٰ پیش نہیں کیا۔

اس دور کے بعض فہمیدہ افراد کو انگریزوں کی اس پالیسی کا شعور ہو گیا تھا۔ وہ اس کو "ٹھنڈی چھری" اور "میٹھا زہر" کہتے تھے جیسا کہ سرسید احمد خاں نے ان کا ایک قول نقل کیا ہے۔ درحقیقت یہ (SLOW POISONING) کا عمل تھا اور کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ کامیاب نہیں ہوا۔

فارسی نصاب دراصل مغل دور حکومت کا سول سروس کا نصاب تعلیم و تربیت تھا۔ لارڈ ہارڈنگ نے ۱۱ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو ایک حکم نامہ جاری کیا اور غیر انگریزی خواں افراد پر ملازمت کے دروازے بند کر دیئے۔ ۱۸۶۱ء میں صدر امینی کو ہائی کورٹ میں تبدیل کر دیا اور وہاں بھی انگریزی زبان رائج کر دی۔ ۱۸۶۴ء میں قاضی ایکٹ منظور ہوا جس کے تحت مسلمانوں کے شخصی معاملات (طلاق و وراثت وغیرہ) میں مسلمان قاضی کی ضرورت نہ رہی۔ ان پے در پے حملوں کے بعد مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ بقول سرسید "اب ہائی کورٹ میں جا کر علماء، علوم مشرقی (وکلاء) کا حال دیکھو۔ ان کے منہ پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔"

افلاس کی وجہ سے مدارس کو تباہ کر دیا، اور مسلمانوں کی کمر توڑ دی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ میں بھی انتقام انگریزوں نے مسلمانوں سے لیا۔ بقول سرسید:

"غدر کیسا ہوا۔ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

(حیات جاوید۔ از مولانا الطاف حسین حالی۔ ص ۲۸۱)

(مقالات سرسید احمد خاں، حصہ ہشتم، ص ۲۴۹، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء)

جنگ میں جو مارے گئے وہ تو مارے گئے۔ جنگ کے بعد سات ہزار علماء اور معاملہ فہم

سر برآوردہ لوگوں کو انگریزوں نے پھانسی پر چڑھا دیا۔ اس طرح صرف عوام الناس باقی رہ گئے سربراہان قوم فنا ہو گئے۔ ان جاں گسل حالات کا تقاضا محسوس کر کے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے تحفظ وجود کے لئے کوشش کی۔ ان کو افلاس اور ادبار کے گڈھے سے نکالا اور مولانا قاسم نانوتوی نے مسلمانوں کے دینی اور علمی سرمائے کو محفوظ کرنے کی کوشش کی اور دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ انھوں نے تو فارسی حصہ بھی جوں کا توں محفوظ رکھا۔ مگر ظاہر ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں نہ فارسی زبان کی حکمرانی رہی اور نہ مغلوں کا نظام حکومت رہا۔ نتیجہ فارسی کی تعلیم گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہو گئی۔ اب دینی مدارس میں صرف عربی حصہ باقی رہا۔ اور فارسی حصہ کٹ کر گر پڑا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے ہفت صد سالہ نصاب تعلیم کا دنیوی حصہ ختم ہو گیا۔ دینی مدارس میں اب صرف دینی حصہ باقی رہ گیا۔ اور امتداد زمانہ سے اب تو یہ شعور بھی باقی نہ رہا کہ موجودہ نصاب تعلیم ناقص ہے، آدھا ہے۔ اس کا دنیوی حصہ باقی نہیں رہا۔ عام طور پر دینی مدارس میں موجودہ عربی حصے کو کافی اور وافی سمجھ لیا گیا ہے۔

دنیاوی تعلیم کی نفی کے اثرات

ان دینی مدارس کے چلانے والوں کو ایسے سازگار حالات میسر نہیں آئے کہ یہ دنیوی نصاب تعلیم کی بازیافت کرتے۔ نئے حالات کے مطابق اردو زبان میں جدید دنیوی علوم کو دینی نقطہ نظر سے مرتب کرتے، ایک نیا دنیوی نصاب وضع کرتے اور پھر اس کو نصاب تعلیم میں شامل کرتے اور دینی تعلیم کو مکمل کرتے۔ انگریزی دور حکومت میں ان کی حالت یہ رہی ہے کہ یہ حکومت کی سرپرستی سے محروم بلکہ حکومت کا رویہ ان کے ساتھ معاندانہ تھا۔ حکومت اور بالائی طبقہ دونوں ان کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ حکومت کے زیر اثر مسلمان معاشرہ بحیثیت مجموعی ان کا قدر دان نہیں تھا۔ غالب دکاندار طبقہ ان کو نظر حقارت سے دیکھتا تھا۔ یہ مدرسے یہ طلبہ یہ اساتذہ طعن و تشنیع کا ہدف بنتے تھے۔ یہ تو سخت جان قسم کے لوگ تھے جو اس معاندانہ ماحول میں بھی زندہ رہے بس غنیمت ہے کہ یہ چلتے رہے۔ بہرحال موجودہ دینی مدارس میں صرف نصاب تعلیم کے عربی حصہ کی تعلیم ہوتی ہے جو زیادہ تر بلکہ اب تو تمام تر دینی علوم سے متعلق ہے۔ فارسی نصاب کی تعلیم بالکل ختم ہو چکی ہے جس کا غالب حصہ دنیوی علوم سے متعلق

ہوتا تھا جس میں عربی علوم، ریاست و حکومت، حکمت و دانائی کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس لئے آجکل دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ دینی علوم کا فہم تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن دنیوی علوم سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ابتدائی شد بد بھی نہیں ہوتی ہے۔ دوسری جانب جدید مغربی طرز کی درسگاہوں میں سارا زور دنیوی علوم پر ہے۔ معاشرتی علوم، طبعی علوم اور دنیوی علوم کے دائرہ کار میں گزشتہ دو صدیوں میں وسعت اور عمق کے اعتبار سے انقلاب عظیم برپا ہو چکا ہے۔ علوم و فنون کی ایک نئی دنیا جلوہ گر ہو گئی ہے۔ ادھر حال یہ ہے کہ قدیم دو سو سال والے معاشرتی علوم بھی موجودہ دینی طلبہ کی دسترس میں نہیں ہیں۔ اب صورت حال یہ بن گئی ہے کہ قدیم مدارس اور جدید کالج ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں سفر کر رہے ہیں۔ دونوں کے درمیان تعلق و ارتباط کے لئے کوئی مشترک میدان باقی نہیں ہے کوئی نقطۂ اتصال نہیں ہے۔ درحقیقت جدید کالجوں کے تعلیم یافتہ اصحاب اور قدیم مدارس کے تعلیم یافتہ علماء کی سطح علم مختلف ہے جو ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے نہ ہی ایک دوسرے کی ذہنیت سے باخبر ہیں اور نہ آشنا ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"ایک طرف یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعلیم اور ان کے تعلیم یافتہ افراد ہیں، اور دوسری طرف دینی مدارس و مکاتب اور ان کے پڑھے ہوئے علماء و فضلاء ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے علم اور دوسرے کے نقطۂ نظر سے ناواقف ہے اور ان کو ناواقف بنا کر رکھا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ علم کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ عوام ان کے ہاتھوں میں فٹ بال کی گیند بنے ہوئے ہیں۔ ایک ختم ہونے والی کشمکش جو جاری ہے .... ایک طبقہ عوام کی گردنیں پکڑ کر آگے کی طرف دھکیل رہا ہے اور دوسرا ان بے چاروں کا دامن پکڑ کر پیچھے گھسیٹ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ علم کے دونوں نمائندے فکر کی اس منحوس کارروائی میں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں، نہ ان کا اثر قائم ہوتے پاتا ہے نہ ان کی بات چلتی ہے۔ مسلمانوں کو نہ دین پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے نہ دنیا میں آگے بڑھنے کی توفیق میسر کرتی ہے۔"

(نظام تعلیم و تربیت۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ص ۳۴۷)

ان حالات میں اچانک ۱۹۷۷ء کے بعد سیاسی فضا تبدیل ہو گئی۔ اب اسلامی قانون اور اسلامی نظام حکومت کی صداؤں سے فضا گونج رہی ہے، فوجی حکمران بھی ہمنوائی کر

رہے ہیں۔ ایوان حکومت سے بھی ایسی ہی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ بے اچانک ان لوگوں سے جو ایک مدت سے شاہراہ حیات سے کٹ کر مدرسوں میں گوشہ گیر ہو گئے تھے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ پیش قدمی کریں۔ ملک و ملت کی شرعی قانون کے نفاذ میں اور شرعی سیاست کے اجراء میں راہنمائی کریں۔ یہ مطالبہ بے جا ہے۔ وہ بے چارے اس حال میں نہیں ہیں کہ عوام کا یہ مطالبہ پورا کر سکیں۔

درحقیقت ملت اسلامیہ کا یہ بہت بڑا سانحہ ہے، المیہ ہے۔ قدیم اور جدید کے درمیان نما خلیج کو پاٹے بغیر ملت کی کشتی بھنور سے باہر نکل نہیں سکتی، ملت اسلامیہ کے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور مزید المیہ اس بات کا ہے کہ اس خلیج کی شدت اور سنگینی کا شعور عام نہیں ہے۔ گویا مسلمان عوام اپنے اصل مرض سے ناواقف ہیں اس لئے مرض کو دور کرنے کی کوشش جس پیمانہ پر ہونی چاہئے تھی وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ وقت کی ضرورت یہ ہے، ملت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی غزالی وقت آگے بڑھ کر مغربی علوم کو مسلمان کرے پھر دینی و دنیوی اجزاء کو ملا کر ایک جدید نصاب تعلیم ترتیب دے اور رائج کرے۔

؎ یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

عصری علوم سے ناواقفیت کے علاوہ ایک اہم نقص اور بھی ہے۔ ان مدارس میں دین کو بھی اس کی جامعیت کے ساتھ نہیں پڑھایا جاتا ہے۔ قرأت خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین جیسے مسائل وغیرہ پر تو اساتذہ کئی کئی دن تقریریں کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے معائب اور نقائص کا کوئی ذکر نہیں کرتا، دین اور دنیا کے خسارہ کا کوئی ذکر نہیں، اہل علم کے اندر جو خوبیاں اور محاسن و ملکات ہونے چاہئیں ان کو پیدا کرنے کی کوئی فکر نہیں۔ مدرسوں میں طلبہ کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ جدید دور کے علماء و مدرسین کو اپنی ذمہ داریوں کا شعور ہونا چاہئے اور ان امور کی جانب توجہ کرنی چاہئے۔ ●●

حرفِ دانش

ڈاکٹر احمد سجاد

یہ کہنا حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ انسان کو خدا نے جو سب سے بڑی نعمت دی ہے وہ مذہب ہے اور انسان کا سب سے بڑا روحانی کارنامہ اس کا ادب ہے۔ دراصل مذہب اور ادب ہی نے پوری انسانی تاریخ کو سب سے زیادہ ہمہ گیر انداز میں متاثر کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسانی تاریخ کی ساری کاوشیں اصلاً دین و ادب کی رہینِ منت ہیں۔ فلسفہ، سائنس اور دیگر علوم کی ساری ترقیوں کا واحد مقصد یا تو انسان کی اپنی خوشی میں اضافہ کرنا یا رضائے الٰہی کا حصول ہی رہا ہے۔ چنانچہ ادب اگر جمالیاتی انداز میں ہمارے جذباتی و تخیلی انبساط کا بہترین ذریعہ ہے تو مذہب ہماری روحانی و اخلاقی تسکین و ارتقا کا موثر ترین وسیلہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں دین و تصوف اور ادب کے حسین امتزاج پر زور دیا جاتا رہا ہے۔

موجودہ صدی کے اوائل تک جدید مادی اور سائنسی ترقیوں نے انسانی عقل و فکر کو کچھ ایسا مسحور و مسخر کر دیا تھا کہ اس نے دین و ادب کی اس آفاقی قدر و جہت کو وقتی طور پر نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ چنانچہ ادب کو کاریے کاراں اور مذہب کو افیون باور کرایا جانے لگا تھا۔ اس میں کچھ قصور فنکاروں کی بے بصیرتی اور مذہب پسندوں کے فکری و عملی جمود کا بھی تھا مگر پچھلے پچاس برسوں میں لادینیت اور مادہ پرستی کی بنیاد پر جس تہذیب و سیاست کو فروغ دیا گیا اس نے محض چند برسوں میں پوری دنیا کو دو عظیم جنگوں کی جہنم میں جھونک دیا اور اب اس خطرہ سے پوری انسانیت لرزہ براندام ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی بہانے تیسری عالمی جنگ چھڑ گئی تو اس کرۂ ارضی کا کیا حشر ہوگا۔

لیکن جنگوں سے قطع نظر موجودہ لادینی اور یک رخی تہذیب و معاشرت نے جو ایک نیا عالمی بحران پیدا کر دیا ہے اس نے ساری انسانی ترقیوں پر ایک طرح سے پانی پھیر دیا ہے۔ غلّوں کے

ڈھیر پر بیٹھا ہوا انسان فاقوں سے مر رہا ہے۔ پورے گلوب کو کپڑوں کی کئی تہوں میں لپیٹ دینے والے انبار کے باوجود اکثریت چیتھڑوں میں ملبوس ہے۔ فنِ معماری اور فنِ طب کے ماہرین کی فوج کے درمیان انسانیت کو سر چھپانے کی جگہ نہیں اور بیماریوں سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ امنِ عالم اور تخفیفِ اسلحہ کی دُہائی دینے والے ہر روز انسانیت کش جوہری بموں کے ہلاکت خیز تجربوں سے دنیا کو جہنم زار بناتے جا رہے ہیں اور کمزور ممالک کی پتی ہوئی قوموں، قتل و غارت گری کا شکار بنا رہے ہیں۔ ان سب پر مستزاد دیگر مختلف ازموں کے بلند و بانگ دعوے انسانی زندگی کی تلخیوں میں اضافہ ہی کرتے جا رہے ہیں۔

اس ہلاکت سے تحفظ کی ایک ہی صورت ہے کہ انسانی زندگی کو بصیرت و مسرت سے ہمکنار کیا جائے۔ واضح ہو کہ بصیرت دراصل زندگی کی روحانی و اخلاقی تعبیر ہی کا دوسرا نام ہے اس کے بغیر کوئی نگاہ بھی بے ضمیری اور بے بصیرتی کا دور دورہ ہے۔ یہ بصیرت ہی ہے جو معنویت کی نئی تہوں کو کھولنے والی ہوتی ہے، جو ماحول کی محض پکار اور ترجمان یا عکاس نہیں ہوتی بلکہ انسانی معاشرے کو متشکل کرنے والی، اسے نیا حوصلہ اور ولولۂ تازہ عطا کرنے والی، تشکیک کے بجائے یقین سے ہمکنار کرنے والی، نئی منزلوں اور مایوسیوں کے گھپ اندھیرے میں امید کی روشنی، ذہنی ارتقاع اور روحانی عظمت عطا کرنے والی ہوتی ہے اسی لئے ایلیٹ نے تسلیم کیا ہے کہ "ادب کی عظمت صرف ادبی معیاروں سے نہیں جانچی جا سکتی"۔ اسی خیال کو وہ دوسرے لفظوں میں یوں ادا کرتا ہے کہ "ہر اچھا شاعر خواہ عظیم شاعر ہو یا نہ ہو وہ مسرت کے سوا کچھ اور بھی دیتا ہے"۔ "یہ مسرت کے سوا" "بصیرت" کے علاوہ اور کیا ہے۔ ادب کا یہ بصیرتی پہلو ہی ہے جو غالب سے "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" اور اقبال سے "نوائے شاعرِ فردا" کہلواتا ہے اور مستقبل کے لئے ایسی بشارتیں دیتا ہے کہ ماضی و حال کا ہر بحران کے فکر و فن کو فراموش کرنے کے بجائے حیاتِ تازہ اور آفاقیت سے ہمکنار کرتا ہے۔

اسی بصیرت نے موجودہ تشویشناک صورتِ حال پر سنجیدگی سے سوچنے سمجھنے والے انسانوں کو دوبارہ دین و تحریک اور تصوف و روحانیت کی طرف مائل کر دیا ہے۔ آج کا ادیب اور فنکار بھی ادبی سوتوں کی تلاش میں اساطیر، دیومالا اور مختلف قسم کے اوہام و خرافات کی

وادیوں سے نکل کر دین داری و خدا پرستی کی طرف نکل آیا ہے۔ دین و تصوف کے درمیان ہمیشہ سے ہی جو گہرا رشتہ رہا ہے اہل نظر اس سے خوب واقف ہیں۔ تصوف نے ایک زمانے میں جبر و ظلم، استحصال، اور خوشامد چاپلوسی کی فضا میں آزادی، انسانیت و دوستی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، دنیا سے بے رغبتی اور خود اعتمادی کی روح میں جو بصیرت، تقویٰ اور سرور انگیز ادب کا نامہ پیش کیا ہے وہ آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔ اس نے زبان و ادب اور تہذیب کو جن اعلیٰ اخلاقی قدروں سے مالا مال کیا ہے ان سے بھی لوگ خوب واقف ہیں مگر ادب و تصوف کے نام پر جو تقدس پایا اور بے لگامیاں ہوئی ہیں ان سے انسان کو تو کافی نقصان بھی ہوا ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر اخلاقی و ادبی اقدار کی تشکیل نو کی جائے تاکہ موجودہ اخلاقی و ادبی بحران پر قابو پایا جا سکے۔

ع فکر کے خورشید کا سامان سفر تازہ کریں

(بشکریہ "آل انڈیا ریڈیو رانچی")

بقیہ: آزادیٔ نسواں

یورپ آج پھر بعینہٖ وہی شرمناک تاریخ تحریک آزادیٔ نسواں کا نعرہ لگا کر دہرا رہا ہے اور عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش چلنے کی کھلی دعوت دے رہا ہے۔ جو اس کے پرستاروں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور آزادیٔ نسواں کا پیغام دنیا کے گوشہ گوشہ میں عام ہو گیا عورتیں بے پردہ ہو گئیں اور تمام ان افعال قبیحہ کی مرتکب ہو گئیں جن کا تذکرہ رومانی حکومت کے ضمن میں ہوا۔ جس سے یورپ کے انحطاط کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جبکہ اس تہذیب کا وہی حشر ہوگا جو رومانی تہذیب کا ہوا۔ ایسی حالت میں مسلمان خواتین کا پردے میں رہنا اس طرح کے فتنے میں پڑنے سے بچاؤ کا بہت عمدہ ذریعہ ہے اور اسلام کا پردے کا حکم عین مطابق حکمت ہے جس کی شہادت چودہ سو سالہ تاریخ بانگ دہل دے رہی ہے۔ ● ●

غزل

شفیع اللہ خان راز

تاریکیوں کو گوشۂ دل سے نکالیے
بزم حیات نور کے سانچے میں ڈھالیے

رسوائیوں کے خوف سے آنسو چھپا لیے
دنیا سمجھ رہی ہے کہ ہم مسکرا لیے

دنیا کے سامری ہیں اُٹھا تو کیا ہوا
بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی کلیمی عصا لیے

رگ رگ سے اس کی نور کے چشمے ابل پڑے
جس نے چراغ خانۂ دل کے جلا دیے

انسان کے دماغ کی جدت تو دیکھیے
انسانیت کے سینکڑوں خانے بنا لیے

اس آدمی کی روح اندھیرے میں غرق تھی
در در بھٹک رہا تھا جو جلتا دیا لیے

دھرتی ہے سوگوار، فلک اشکبار ہے
ہم پر وہ ظالموں نے ستم آزما لیے

افتادہ ہے پڑا گوہر نایاب زیر آب
جی چاہتا ہے راز سمندر اچھالیے

نعت

عبدالحفیظ

محبت آپ سے ہو انتہائی
تو پھر ایمان نے تکمیل پائی

سراپا زندگی ان کی قیادت
سراسر دین ہے ان تک رسائی

دیا درس ایک رب کی بندگی کا
ملی ہر اک غلامی سے رہائی

نکھار آیا صداقت کی جبیں پر
جہالت نے بہر سو مات کھائی

تھی جب اولاد آدمؑ پارہ پارہ
نوید وحدت آدم سنائی

ملائے آپ نے ٹوٹے ہوئے دل
بنایا دشمنوں کو بھائی بھائی

زمانے کو دیا درس مساوات
تمیز بندہ و آقا مٹائی

کیا ثابت کہ تسخیر جہاں میں
محبت ہی ہمیشہ کام آئی

وہ جس سے دنیا و عقبیٰ سنور جائے
کچھ ایسی آپ نے کی رہنمائی

سکھایا پیشوائی کا سلیقہ
یہ ہوتا ہے کمال پیشوائی

ہے حاصل ان کی بندہ پروری کا
[illegible]

رپورٹ اجلاس شوریٰ انجمن طلبۂ قدیم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

۸، ۹ر مارچ ۱۹۸۹ء کو نماز مغرب کے بعد سے اجلاس کا آغاز ہوا جو دوسرے دن بھی جاری رہا۔ اس میں انجمن کے مندرجہ ذیل ارکان شریک ہوئے۔

مولانا نسیم احمد غازی صاحب (صدر انجمن)، مولانا رحمت الاثری صاحب فلاحی، مولانا انصار احمد صاحب فلاحی، مولانا محمد عمران صاحب فلاحی، مولانا نور محمد صاحب فلاحی، مولانا مقبول احمد صاحب فلاحی، مولانا معین الدین صاحب فلاحی، مولانا عبدالسلام صاحب فلاحی اور جاوید اشرف (سکریٹری انجمن) شریک ہوئے۔

مولانا ابوالمکارم صاحب فلاحی، مولانا خالد حامد صاحب فلاحی، مولانا شبیر صاحب فلاحی اور مولانا عبید اللہ صاحب فلاحی شریک نہیں ہو سکے۔

کارروائی کا آغاز مولانا مقبول احمد صاحب فلاحی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد گزشتہ کارروائی کی خواندگی ہوئی۔ زیر طے شدہ امور کا جائزہ لیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی کہ دستوری ترمیمات جلد از جلد عام ممبران انجمن کو روانہ کی جائیں تاکہ ان کی رائیں آ جائیں۔

انجمن نے گزشتہ اجلاس میں جامعہ کے مرکزی مکتبہ کی عمارت کی تعمیر اپنے ذمہ لی تھی طے ہوا کہ اس کے لئے مہم کا آغاز کر دیا جائے۔ اس مہم کی ذمہ داری جناب شبیر صاحب فلاحی پر ڈالی گئی وہ اس کا تفصیلی خاکہ بنا کر کام شروع کر دیں گے۔

طے ہوا کہ "حیاتِ نَو" کی ترتیب وغیرہ میں ابھی مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے تعاون حاصل کیا جاتا رہے۔ ان سے درخواست کی گئی اور انھوں نے عارضی طور پر یہ ذمہ داری قبول کر لی البتہ عارضی ہی طور پر طباعت و مراسلت کی ذمہ داری ولی اللہ صاحب فلاحی کے ذمہ ہوگی۔

طے ہوا کہ آئندہ "حیاتِ نَو" کا سالانہ زرِ تعاون چالیس ۴۰ روپیہ ہوگا جبکہ ایک شمارہ کی قیمت چار ۴ روپیہ ہوگی۔

آخر میں دعا پر اس کارروائی کا اختتام ہوا۔ والسلام

(جاوید اشرف فلاحی ۔ سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم)

زمخشری اور "الکشاف"

عبدالبر اثری فلاحی

تعارف

نام محمود بن عمر بن محمد بن عمر، کنیت ابوالقاسم، نسبت زمخشری حنفی معتزلی اور لقب جار اللہ اور فخر خوارزم تھا۔ ۲۷ رجب ۴۶۷ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۰۷۵ء کو بدھ کے دن خوارزم کے زمخشر نامی گاؤں میں پیدا ہوئے جو آج کل سوویت یونین کی ریاست ازبکستان کا حصہ ہے۔ نوجوانی ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ طلب علم کے خاطر بخارا اور بغداد کا سفر کیا۔ اسی طرح کے کسی سفر میں ایک پیر بھی ضائع ہو گیا تھا۔ بطور خاص ابو مضر سے استفادہ کیا۔ پوری زندگی علمی مشاغل میں گزری حتی کہ اسی میں خلل کے اندیشے سے شادی تک نہ کی۔ ۶۶ سال کی عمر میں دوسری بار حج اور بیت اللہ سے لوٹتے ہوئے خوارزم کے صدر مقام جرجانیہ پہنچ کر ۵۳۸ھ / ۱۱۴۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علم و فضل

گرچہ انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، جغرافیہ، ادب، سیر و رجال، مواعظ، نحو، اعراب، لغت، امثال، خطبات، شعر، غرضیکہ علوم دینیہ اور عربی زبان و ادب کے تقریباً ہر گوشے میں اپنی بلند پایہ تصنیفات چھوڑی ہیں جو بعد والوں کے لئے قیمتی علمی سرمایہ اور ان میدانوں میں ان کی مہارت کی دلیل ہیں تاہم وہ تفسیر، نحو و لغت اور ادب میں عدیم المثال تھے جیسا کہ یاقوت رومی نے لکھا ہے:

"كان اماما فى التفسير والنحو واللغة والأدب، واسع العلم، كبير الفضل، متفننا فى علوم شتى (معجم الأدباء ۱۹ / ۱۲۶) وہ تفسیر، نحو، لغت اور ادب میں امام تھے۔ بڑی وسعت اور فضل والے تھے اور بہت سارے علوم میں رسوخ رکھتے تھے"

چنانچہ وہ جہاں کہیں بھی جاتے لوگ ان سے استفادے کے لئے ٹوٹ پڑتے، خود انھیں بھی اس کا احساس ہو چلا تھا لہٰذا وہ اپنے آپ کو "کعبۂ ادب" کہا کرتے تھے: "وانی فی خوارزم کعبة الأدب" (المنجد ـ ص ۳۵۰)

تصانیف وتالیفات

اب تک کی تحقیق کے مطابق ان کی ۷۳ تصانیف کا ہمیں علم ہو سکا ہے جن میں ۱۷ مطبوعات، ۱۸ مخطوطات اور ۳۸ ضائع شدہ کتب ہیں۔ مخطوطات اور ضائع شدہ کتب کے اسماء پروفیسر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب "تفسیر الکشاف ایک تحلیلی جائزہ" بالترتیب ص ۱۷۱ تا ص ۱۷۷ میں دیکھے جا سکتے ہیں، البتہ مطبوعات کی فہرست افادہ کی خاطر ملاحظہ فرمائیں:

۱: الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل۔
۲: الفائق فی غریب الحدیث، ۳: المستقصی فی الامثال، ۴: المفصل،
۵: الانموذج، ۶: اساس البلاغة، ۷: مقدمة الادب، ۸: الامکنة والجبال والمیاہ،
۹: مقامات الزمخشری، کتاب النصائح الکبار، ۱۰: اطواق الذہب، النصائح الصغار،
۱۱: نوابغ الکلم، ۱۲: اعجب العجب فی شرح لامیة العرب، ۱۳: مرثیة ابی مضر،
۱۴: ربیع الابرار ونصوص الاخبار فی الادب والنوادر، ۱۵: شرح مقامات الزمخشری
۱۶: القسطاس المستقیم فی العروض، ۱۷: المحاجاة بالمسائل النحویة۔

تفسیر "الکشاف"

ان کی ان تمام تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت "الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل" کو حاصل ہے۔ تفسیر قرآن کی دنیا میں بعض حیثیتوں سے اسے بنیادی ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم کم از کم اجمالی طور پر اس کے حسن وقبح سے ضرور واقف رہیں۔ اسی لئے آئندہ سطور میں تحریر کی جا رہی ہیں۔

سبب تالیف

۵۰ سال کی عمر میں ان پر ایک شدید مرض کا حملہ ہوا اور فطرت کے مطابق انھوں نے اس وقت اپنی گزشتہ زندگی کا احتساب کیا تو عبادت الٰہی کے کھاتے میں کچھ بھی نہ تھا بلکہ جو کچھ انھوں نے کیا تھا سب حصول جاہ و

منصب وغیرہ کے لئے تھا لہٰذا اسی وقت انھوں نے اللہ سے عہد کیا اگر زندہ رہا تو آئندہ زندگی اللہ کی چاکری اور خدمت دین میں گزاروں گا اور تبھی انھوں نے اپنی ساری سرگرمیوں کو خدمت دین کا رخ دے دیا اور لوگ بھی دینی معاملات میں ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ اسی ضمن میں جب انھوں نے تفسیری نکات پر گفتگو کی تو اس چیز نے لوگوں کو کافی متاثر کیا اور لوگوں نے ان سے پوری تفسیر لکھنے کا مطالبہ کیا، اولاً تو انھوں نے انکار کیا لیکن لوگوں کا اشتیاق دیکھ کر آمادہ ہو گئے۔ کشاف کے مقدمے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت، اس کے معجزانہ انداز بیان، اس کے وجوہ اعجاز اور علم معانی وبیان کو پیش نظر رکھ کر تفسیر قرآن کے لکھے جانے کی اہمیت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے کیونکہ اب تک اس نہج پر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی تھی اور نہ ہی اس وقت انھیں کوئی اس نہج پر لکھنے والا ہی نظر آ رہا تھا چنانچہ انھوں نے خود ہی اپنی خدمت اس محاذ پر لگا دینا ضروری سمجھا اور یہ کام شروع کر دیا۔

مقصد تالیف

مقصد تالیف محرکات تالیف سے خود واضح ہے۔ اسی کو پروفیسر فضل الرحمٰن صاحب نے یوں بیان کیا ہے کہ "اس کی تالیف کے دو مقصد تھے جو شروع سے آخر تک مؤلف کے پیش نظر رہے۔ سب سے پہلا اور غالباً اہم تر مقصد یہ تھا کہ اس تفسیر کے ذریعے مسلک اعتزال کی خدمت کی جائے۔ دوسرا یہ کہ قرآنی فصاحت وبلاغت کے دقائق کو منظر عام پر لایا جائے اور اسی طرح قرآنی اعجاز کے بنیادوں کو استوار کرتے ہوئے اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کے جمال کو بے نقاب کیا جائے۔" (زمخشری کی تفسیر الکشاف ایک تحلیلی جائزہ: ص ۱۸۲)

مدت تالیف

مدت تالیف کے سلسلے میں آپ نے مقدمہ کے اندر لکھا ہے کہ ابوبکرؓ کی خلافت کی مدت کے برابر مدت میں انہوں نے اس تفسیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور صحیح ترین قول کے مطابق یہ مدت دو سال تین ماہ نو دن آتی ہے۔ کشاف جیسے جامع اور وسیع تفسیر کے لئے یہ مدت حد درجہ کم ہے لیکن انھوں نے بالقصد اتنی جلدی کی تھی کیونکہ زندگی کے آخری مرحلے میں اس کام کو شروع کیا تھا اور شرح وبسط کے ساتھ

لکھنے میں ان کے قول کے مطابق تیس سال کی مدت درکار تھی، اور عمر کو دیکھتے ہوئے یہ خطرہ تھا کہ شاید تفصیل کی صورت میں کام مکمل نہ ہوسکے اور ہمیشہ کے لئے ناتمام رہ جائے۔ یہ تفسیر انھوں نے جوارِ بیت اللہ میں دوبارہ قیام کے زمانہ ۵۲۶ھ تا ۵۳۳ھ کے درمیان لکھی۔ حاجی خلیفہ کے قول کے مطابق یہ تفسیر ربیع الآخر ۵۲۸ھ میں مکمل ہوئی۔

طریقۂ تفسیر

اس کے طرزِ تفسیر پر بحث کرتے ہوئے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے لکھا ہے کہ "علامہ زمخشری کی نظر کا محور عموماً عبارتِ قرآن ہوتی ہے۔ یہ پہلے لغت، اعراب اور ربطِ کلام سے بحث کرتے ہیں پھر احتیاط کے ساتھ روایات بھی لاتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت نہایت قابلِ قدر ہے کہ وہ لغت و اعراب میں عموماً صحیح مذہب اختیار کرتے ہیں۔" (مبادئ تدبر قرآن: ص ۷۰)

اسی طرح وہ صرف آیات کا مفہوم ہی پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس تفسیر پر جو بھی اعتراضات کسی نقطۂ نظر سے ہو سکتے ہیں اور قاری کے ذہن میں خلش پیدا کر سکتے ہیں خواہ وہ عقلی ہوں یا نقلی، لغوی ہوں یا نحوی، بلاغی ہوں یا کلامی، زمخشری "فان قلت" کے الفاظ کے ساتھ اشکالات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کے بعد "قلتُ" کہہ کر ان سارے اشکالات کو حل کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح کشاف کے پڑھنے والے کے ذہن و عقل کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

خصوصیات

اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ مسلکِ اعتزال کے مطابق لکھی گئی ہے اور ہر ممکن ذرائع سے معتزلہ کے اصولِ خمسہ (توحید، عدل، وعدہ وعید، المنزلۃ بین المنزلتین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کو بطور خاص اور دیگر فروعات کو عام طور سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس غرض کے لئے انھوں نے آیات کی عقلی توجیہات کی ہیں، قرأت کے اختلاف سے فائدہ اٹھایا، نحوی قواعد کا استعمال کیا ہے، الفاظ کے معانی میں توسیع کی ہے، ضعیف روایات کا سہارا لیا ہے اور فنِ معانی و بیان کے اصولوں کو استعمال کیا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر قرآن مجید کے بلاغی پہلو کو اجاگر کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر فضل الرحمٰن صاحب اس کے اس پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اہم ترین بات یہ ہے کہ یہی وہ پہلی تفسیر ہے جس نے معانی و بیان کے اصولوں کا انطباق قرآن کی آیات کی تفسیر پر کیا۔ قرآن کی زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے دنیا کو روشناس کرایا اور عملی طور سے یہ ثابت کر دیا کہ قرآن اپنے نظم و اسلوب اور معانی و مفاہیم کے اعتبار سے ایک عظیم معجزہ ہے اور اس کی نظیر و مثیل ممکن نہیں۔ قرآن کا وہ مسحور کن نفسیاتی اور معنوی حسن و جمال جس کا نظارہ بلاغتِ قرآنی کے دقائق و رموز کی پردہ کشائی پر منحصر تھا، اسے کشاف ہی نے عام کیا۔"

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں: "کشاف کا کارنامہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس نے بلاغی رجحان کو ایک نہایت مؤثر عنصر کی حیثیت سے فنِ تفسیر میں داخل کر دیا اور اعجاز القرآن کی بحث کو ایک فیصلہ کن مرحلے پر لا کھڑا کر دیا بلکہ اس کے ذریعہ سے فنِ بلاغت کے دونوں شعبوں معانی و بیان میں ایسے بے شمار اور بیش بہا نئے اضافے ہوئے جنھوں نے اس فن کو نئی وسعتیں، گہرائی اور گیرائی بخشی اور جن پر یہ فن بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔"
(زمخشری کی تفسیر الکشاف ایک تحلیلی جائزہ: ص ۲۸۱ تا ۲۸۲)

اس کی شاعرانہ سے پوری تفسیر بھری پڑی ہے۔ اس میدان میں انھوں نے بہت سی نئی تحقیقات اور نئی راہیں بھی پیش کی ہیں مثلاً اظہار بدون اللّٰہ کی بلاغت وغیرہ۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت مختصر ہے، حشو و زوائد و طوالت سے خالی ہے۔ حالانکہ اپنے مباحث کے لحاظ سے اسے کافی ضخیم ہونا چاہئے تھا۔ اس کی اس خوبی کو مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سب سے بڑی خوبی بتایا ہے وہ لکھتے ہیں: "وجل محاسنه انه وجیز" اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مختصر ہے۔ (حاشیہ التکمیل فی اصول التاویل: ص ۶)۔

اس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کی بھی رعایت کی گئی ہے بلکہ زمخشری کے بنیادی تفسیری اصول میں سے ہے جیسا کہ انھوں نے سورہ ہود،

آیت ۱۰ کے تحت لکھا ہے اور اس کی عملی مثال سورہ بقرہ آیت ۲۵۴ کے اندر دیکھی جا سکتی ہے۔

اس کی پانچویں خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر تفسیر بالماثور کا بھی وافر حصہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ چنانچہ کشاف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، صحابہ کرامؓ کی تفسیری روایات اور تابعین کی تشریحات قدم قدم پر ملتی ہیں۔ البتہ معتزلی ہونے کی وجہ سے علویین کی روایات زیادہ قبول کرتے ہیں اور ان کا مأخذ نہیں بتلاتے حالانکہ احادیث اور تفسیری روایات پر گہری نظر رکھتے تھے جیسا کہ ابن حجر کی تخریج احادیث کشاف سے معلوم ہوتا ہے، ساتھ ہی انھیں وہ صرف نقل کرتے ہیں، ان میں باہم تطبیق یا ترجیح نہیں دیتے جیسا کہ سورہ دخان آیت ۱۰، سورہ ص آیت ۷۷، اور سورہ (مسئلہ ذبیح) صافات آیت ۱۰۲ تا ۱۱۱ کی تفسیر میں دیکھا جا سکتا ہے حالانکہ یہ رویہ ان کی عقلیت پسندی کے بالکل خلاف ہے۔

اس کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اسرائیلیات کو بھی نقل کرتے ہیں۔ جب ان کے ذریعے عصمت انبیاء مجروح ہوتی ہے تو سخت تنقید بھی کرتے ہیں جیسا کہ سلیمانؑ اور داؤدؑ کے متعلق روایات پر سورہ ص آیت ۳۴، اور آیات ۲۱، ۲۲ میں بحث کی ہے اور یوسفؑ کے متعلق روایت پر سورہ یوسف آیت ۲۴ پر بحث کی ہے ورنہ وہ روایات جن کا تعلق دینی معاملات سے نہیں ہوتا "واللہ اعلم" کہہ کر اس کا علم خدا کی ذات کو سونپ دیتے ہیں۔ اور رُوِیَ بصیغہ مجہول کہہ کر ذکر کر کے گویا اس کے ضعف اور عدم صحت کی جانب بھی اشارہ فرماتے ہیں گویا اس سلسلے میں انھوں نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔

اس کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ ضرورت کے لحاظ سے وہ اسباب نزول کی روایات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اگر متعدد روایات ہوں تو تمام کا ذکر کرتے ہیں۔ عام طور سے نقد و جرح بھی نہیں کرتے البتہ کہیں کہیں انھوں نے تنقید اور ترجیح سے بھی کام لیا ہے جیسا کہ سورہ احقاف آیت ۱۷، اور سورہ توبہ آیت ۱۱۳ کی تفسیر میں انھوں نے کیا ہے۔

اس کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ اختلاف قرأت کے ذکر کو بھی انھوں نے اپنی تفسیر میں

جگہ دی ہے۔ البتہ مفہوم کے قوت و ضعف کے لحاظ سے ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح مختلف قرأتوں کی مختلف توجیہات بھی کرتے ہیں۔ اس ترجیح میں وہ نظم، بلاغت اور نحوی قواعد کا لحاظ کرتے ہیں اور اس میں قرأت سبعہ کے تواتر کو بھی کبھی کبھی مجروح کر دیتے ہیں۔

اس کی نویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر سورہ کے اخیر میں فضائل سورہ کی روایات کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ ان میں سے اکثر موضوع ہیں لیکن ان پر کسی قسم کا کلام نہیں کرتے یہ ان کی بہت بڑی کمزوری اور عقلیت پسندی کے خلاف ہے۔

اس کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عقلی تفسیر ہے جس کی بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً سورہ بقرہ آیت ۶۱ اور سورہ نساء آیت ۵۶ کی تفسیر دیکھیے۔ اس خصوصیت کا مظاہرہ انھوں نے قرآنی اعجاز کے بیان، جملوں کے ربط و نظم، تناقض قرآن اور تضاد قرآن و حدیث کو ختم کرنے کے مباحث میں بطور خاص کیا ہے۔ اسی پہلو سے وہ آیات سے استنباط بھی کرتے ہیں مثلاً سورہ نساء آیت ۵۸ اور سورہ واقعہ آیت ۶۲ کا استنباط ملاحظہ فرمائیے البتہ بسا اوقات حد سے تجاوز بھی کر جاتے ہیں مثلاً سورہ نحل آیت ۴۹، ۵۰ سے ملائکہ کو مکلّف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کی گیارھویں خصوصیت یہ ہے کہ زمخشری نے کہیں کہیں اس میں فقہی مسائل سے بھی تعرض کیا ہے مگر اس میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھاتے۔ مسلکاً وہ حنفی تھے، اس کی حمایت بھی کرتے ہیں لیکن اس حمایت میں تعصب نہیں برتتے۔

توجہ طلب

ان خصوصیات کے ضمن میں یہ بات بھی واضح رہے کہ اس کے اندر بہت سے جدلی مباحث انتہائی شدت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں مثال کے طور پر اہل سنت پر طنز و استہزاء کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ عام طور سے وہ انھیں مجبرہ، حشویہ، مشبّہ، مبطلہ، اہل البدع والاہواء کے نام سے یاد کرتے ہیں حتی کہ سورہ اسراء کی پہلی آیت کی تفسیر میں اہل سنت کو اعداء اللہ قرار دیا ہے بلکہ آل عمران آیت ۱۸ میں تو اہل سنت کو خارج از اسلام قرار دے دیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے تصوف اور صوفیاء پر سخت تبصرے کیے ہیں۔ ان کے محبت و عشق کے دعووں، رقص و غنا اور وجد و سماع کو

شریعت کی نظر میں مبغوض ترین شے اور خود انھیں جاہل اور احمق قرار دیا ہے، کرامات اولیاء کو باطل اور ایک لغو دعویٰ بتایا ہے اور اس سے بڑھ کر انھوں نے یہ جسارت کی ہے کہ رسالت مآب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام کو بھی ملحوظ نہیں رکھا ہے بلکہ یہ تفسیر کی ہے جس سے آپؐ کی توہین ہوتی ہے مثلاً سورہ توبہ میں "عفا اللہ عنک لم اذنت لہم" کی تفسیر کے تحت جو کچھ لکھا ہے اور سورہ تکویر کی تفسیر میں جب انھوں نے جبریلؑ کو نبی کریمؐ سے افضل قرار دیا ہے لہٰذا اس تفسیر سے استفادہ کرنے والوں کو اس پہلو سے چوکنا رہنا ضروری ہے۔ اس توجہ میں ان کے اعتزالی رجحان پر نظر بھی از حد ضروری ہے۔

طباعت

اس شہرۂ آفاق تفسیر کو طبع کرنے کا فخر ہندوستان کو حاصل ہے۔ سب سے پہلے کلکتہ میں ۱۸۵۶ء/۱۲۷۳ھ میں ۲ جلدوں میں آہنی ٹائپ سے نساؤ لیس NASSAU LESS نے مولوی خادم حسین اور مولوی عبدالحی کی تصحیح کے بعد شائع کیا پھر دار الطباعۃ المصریہ بولاق سے ۱۸۶۴ء/۱۲۸۱ھ میں ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ میں حاشیہ "تنزیل الآیات" للدمشقی کے ساتھ شائع ہوئی۔ سنہ ۱۳۰۲ھ میں المطبعۃ المیمنیہ مصر سے بھی ۲ جلدوں میں شائع ہوئی۔ مطبعہ آفتاب ایران سے بلا تاریخ چار جلدوں میں شائع ہوئی۔ پھر قاہرہ سے ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں المطبعۃ العامرۃ الشرفیہ سے دمشقی کے حاشیہ کے ساتھ اسی سن میں مطبعۃ الشرفیہ سے ابن المنیر کی کتاب "الانتصاف" کے ساتھ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں شریف علی جرجانی اور دمشقی کے حاشیہ کے ساتھ مطبعہ محمد مصطفےٰ سے اور ۱۳۱۸-۱۹ھ/۱۹۰۰ء نیز ۱۳۵۴ھ/۱۹۵۴ء میں متعدد ایڈیشن نکلے، البتہ اخیر میں ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء میں قاہرہ ہی سے مطبعۃ الاستقامہ سے مصطفیٰ حسین احمد کی ضبط و تحقیق اور تصحیح کے بعد درج ذیل چار حواشی کے ساتھ شائع ہوئی اور برابر اسی طرح شائع ہو رہی ہے۔ انھیں حواشی کے ساتھ بلا تاریخ کے دار الکتاب العربی بیروت و لبنان نے بھی شائع کیا ہے۔ وہ حواشی یہ درج ذیل ہیں:

معروف حواشی

(۱) الانتصاف لاحمد بن المنیر الاسکندری۔ (۲) الکاف الشاف فی تخریج احادیث الکشاف لابن حجر العسقلانی (۳) حاشیۃ الشیخ محمد علیان المرزوقی سے

باقی [illegible] پر

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

تعلیم کا آغاز

۴ رمئی ۱۹۸۹ء مطابق ۸ رشوال کو جامعہ دوبارہ کھل گیا، نیا نظام الاوقات بنا اور اساتذہ کے درمیان مضامین تقسیم ہوئے۔ جامعہ کا شروع سے یہ معمول رہا ہے کہ تعلیم روز اوّل ہی سے شروع ہو جائے۔ چنانچہ طلبہ آئے اور تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ ہمارے لئے جہاں یہ پہلو باعث مسرت ہے وہیں یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوا کہ بہت سے طلبہ کے سرپرستوں نے اپنے بچوں کی بے جا محبت کے نتیجے میں کسی شادی و غمی کے بہانے اپنے بچوں کو تاخیر سے جامعہ بھیجا۔ ان کا یہ طرز عمل ایک طرف جامعہ کے تئیں تعاون کے منافی اور دوسری جانب اپنے بچوں کے حق میں بھی صحیح معنوں میں ہمدردی نہیں ہے۔

جامعہ کھلتے ہی داخلہ کے خواہش مند حضرات کا تانتا بندھ گیا جو اب تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے پہلے ہی اعلان کیا جا چکا تھا کہ داخلے انتہائی محدود پیمانے پر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ داخلہ کے بہت سے شائقین کو مجبوراً یا دل ناخواستہ واپس کرنا پڑا۔

داخلہ کے لئے دور دراز سے اپنے بچوں کو لے کر آنے والے سرپرستوں سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ انھیں جامعہ میں دوران قیام مہمان خانہ نہ ہونے کی وجہ سے جن زحمتوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ سب غیر ارادی اور مجبورانہ تھیں۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان سے صرف نظر کر دیں گے اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جامعہ کی اس ناگزیر ضرورت کی تعمیر و تکمیل کے لئے کسی صاحب خیر کو آمادہ کر دے تاکہ جامعہ میں آنے والے مہمانوں کو راحت مل سکے۔

عربی اول میں داخلے تحریری مقابلہ کے بعد ہوتے ہیں۔ اس سال مقابلہ ۲۰ رمئی ۱۹۸۹ء کو ہوا۔ اس مقابلہ کے پرچے درجہ ہشتم کے نصاب (اردو، ہندی، انگریزی، حساب، تاریخ، جغرافیہ اور جنرل سائنس) سے بنائے جاتے ہیں۔ اس سال عربی اول کے مقابلے میں ۴۵ طلبہ شریک ہوئے جن میں ۳۰ طلبہ کامیاب ہوئے۔

اب تک جامعۃ الفلاح کے شعبہ طلبہ میں ۵۲۸ اور شعبۂ نسواں میں ۷۵۶ نئے داخلے ہو چکے ہیں۔ دارالاقامہ میں اس وقت ۶۲۶ طلبہ اور ۳۲۲ طالبات ہیں۔ اور درجہ اول سے لے کر فضیلت آخری تک طلبہ کے ۳۳ سیکشن اور طالبات کے ۲۰ سیکشن ہیں۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نائب ناظم جامعہ

جامعۃ الفلاح کی انتظامیہ کا حسب معمول سالانہ اجلاس ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء کو جامعہ میں ہوا۔ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی باتفاق دوبارہ جامعہ کے ناظم منتخب ہوئے۔ نائب ناظم جامعہ جناب محمد انور صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر دوبارہ نیابت سے معذوری ظاہر کی۔ چنانچہ بحیثیت نائب ناظم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔

تعلیمی بیداری

جب تک والدین اور سرپرستوں کی طرف سے کسی تعلیمی ادارے کو تعاون نہ ملے اس وقت تک وہ ادارہ خاطر خواہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر والدین اپنے بچوں کو کسی مدرسہ اور اسکول میں داخل کر کے اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنا حق ادا کر دیا۔ بچہ اسکول جا رہا ہے یا نہیں اور اگر جاتا بھی ہے تو ہوم ورک اور مطالعہ کر کے جاتا ہے یا یوں ہی خالی ہاتھ جاتا، اور خالی ہاتھ واپس آجاتا ہے۔ وقت بے وقت مدرسہ پہنچتا اور جب چاہتا ہے وہاں سے چل دیتا ہے، کبھی کاپی نہیں تو کبھی کتاب غائب اور کبھی قلم ندارد۔ ان باتوں سے عام طور پر سرپرست دلچسپی نہیں لیتے، انھیں اس بات کا خیال تک نہیں آتا کہ کبھی استاد سے بچے کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ ایسا بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ دور دراز کا سفر طے کر کے سرپرست جامعہ آئے، چند گھنٹے رہے لیکن بچے سے متعلق اساتذہ و نگراں سے انھوں نے نہ ملاقات کی اور نہ ان کی ترقی و تنزل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جامعہ کے نائب ناظم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے ان ہی باتوں کے پیش نظر مقامی سرپرستوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے قصبہ بلریا گنج کے مختلف مقامات پر اب تک چار، اجتماعی ملاقاتوں کا اہتمام کیا ہے جن میں بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق سرپرستوں کی ذمہ داریوں پر گفتگو کی، انھیں تعلیم کی

اہمیت سے آگاہ کیا اور اس سلسلہ میں اگر کچھ رکاوٹیں انھیں محسوس ہو رہی ہوں تو رکاوٹوں کے دور کرنے میں تعاون کا یقین دلایا۔

انعامی مقابلہ

تعلیمی بیداری لانے کی غرض سے یکم جون ۱۹۸۹ء کو تحریک اسلامی سے وابستہ چند مخلص، دین پسند اور باشعور نوجوانوں کی کوششوں سے جامعۃ الفلاح میں پڑھنے والے قصبہ بلریا گنج کے طلبہ کا ایک تعلیمی مقابلہ ہوا جس میں ثانوی و اعلیٰ درجات کے طلبہ نے حصہ لیا۔ قصبہ کے اندر یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقابلہ تھا۔ اہل قصبہ نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، جامعہ میں پڑھنے والے طلبہ کی صلاحیتوں کا اندازہ کیا اور اس کے اچھے اثرات محسوس کئے۔ اس پروگرام میں کل پانچ مقابلے تھے جس میں تقریباً چالیس طلبہ نے حصہ لیا۔ اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو انعامات دیئے گئے۔ مزید برآں ہر حصہ لینے والے طالب علم کو تشجیعی انعام سے نوازا گیا۔ پروگرام کے اختتام پر صدر پروگرام اور رکن مجلس انتظامیہ جامعۃ الفلاح مولانا محمد یحییٰ صاحب کے ہاتھوں انعامات تقسیم ہوئے۔

انعام یافتہ طلبہ کی فہرست :-

قرأت میں : محمد نعمان درجہ حفظ I ، توحید احمد درجہ حفظ II اور قیام الدین عربی چہارم III ۔ اعلیٰ درجات کے تقریری مقابلہ میں قیام الدین عربی چہارم I ، محمد شاہد عربی دوم II اور اطہر نسیم عربی سوم III ۔ ثانوی درجات کے تقریری مقابلہ میں محمد آصف درجہ ہشتم I ، محمد انظر درجہ ہفتم II اور عبداللہ درجہ ہفتم III ، مضمون نویسی میں عطاء الرحمٰن عربی سوم I ، محمد شاہد اعظمی عربی دوم II اور ضیاء الرحمٰن عربی اول III ۔

عام معلوماتی مقابلہ میں گروپ اے I (شرکاء ۔ قیام الدین، جاوید احمد، ضمیر احمد، اطہر نسیم، محمد شاہد) اور گروپ بی II (شرکاء، ابو طلحہ، عطاء الرحمٰن، عالمگیر، وسیم احمد، تبریز احمد) نظم خوانی کے مقابلہ میں قیام الدین عربی چہارم I ، محمد نعمان درجہ حفظ II ، اور محمد آصف درجہ ہشتم III ۔

کلیۃ البنات

کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح میں باہر اب تک کوئی دفتر نہیں تھا جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اب

اب تک جامعۃ الفلاح کے شعبہ طلبہ میں ۵۲۹ اور شعبہ نسواں میں ۴۵۶ نے داخلے ہو چکے ہیں۔ دارالاقامہ میں اس وقت ۹۳۶ طلبہ اور ۳۰۲ طالبات ہیں اور درجہ اول سے لے کر فضیلت آخری تک طلبہ کے ۲۳ سیکشن اور طالبات کے ۷ سیکشن ہیں۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نائب ناظم جامعہ

جامعۃ الفلاح کی انتظامیہ کا حسب معمول سالانہ اجلاس ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء کو جامعہ میں ہوا۔ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی باتفاق دوبارہ جامعہ کے ناظم منتخب ہوئے۔ نائب ناظم جامعہ جناب محمد انور صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر دوبارہ نیابت سے معذوری ظاہر کی۔ چنانچہ بحیثیت نائب ناظم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔

تعلیمی بیداری

جب تک والدین اور سرپرستوں کی طرف سے کسی تعلیمی ادارے کو تعاون نہ ملے اس وقت تک وہ ادارہ خاطر خواہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر والدین اپنے بچوں کو کسی مدرسہ اور اسکول میں داخل کر کے اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنا حق ادا کر دیا۔ بچہ اسکول جاتا ہے یا نہیں اور اگر جاتا بھی ہے تو ہوم ورک اور مطالعہ کر کے جاتا ہے یا یوں ہی خالی ہاتھ جاتا اور خالی ہاتھ واپس آجاتا ہے۔ وقت بے وقت مدرسہ پہنچتا اور جب چاہتا ہے وہاں سے چل دیتا ہے، کبھی کاپی نہیں تو کبھی کتاب غائب اور کبھی قلم لاپتہ۔ ان باتوں سے عام طور پر سرپرست دلچسپی نہیں لیتے، انھیں اس بات کا خیال تک نہیں آتا کہ کبھی استاد سے بچے کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ ایسا بھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ دور دراز کا سفر طے کر کے سرپرست جامعہ آئے، چند گھنٹے رہے لیکن بچے سے متعلق اساتذہ و نگراں سے انھوں نے ملاقات کی اور نہ ان کی ترقی و تنزل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جامعہ کے نائب ناظم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے ان ہی باتوں کے پیش نظر مقامی سرپرستوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے قصبہ بلریا گنج کے مختلف مقامات پر اب تک چار اجتماعی ملاقاتوں کا اہتمام کیا۔ جن میں بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق سرپرستوں کی ذمہ داریوں پر گفتگو کی، انھیں تعلیم کی

اہمیت سے آگاہ کیا اور اس سلسلے میں اگر کچھ رکاوٹیں انھیں محسوس ہو رہی ہوں تو رکاوٹوں کے دور کرنے میں تعاون کا یقین دلایا۔

انعامی مقابلہ

تعلیمی بیداری لانے کی غرض سے یکم جون ۸۹ء کو تحریک اسلامی سے وابستہ چند مخلص، دین پسند اور باشعور نوجوانوں کی کوششوں سے جامعۃ الفلاح میں پڑھنے والے قصبہ بلریا گنج کے طلبہ کا ایک تعلیمی مقابلہ ہوا جس میں ثانوی و اعلیٰ درجات کے طلبہ نے حصہ لیا۔ قصبے کے اندر یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقابلہ تھا۔ اہل قصبہ نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ جامعہ میں پڑھنے والے طلبہ کی صلاحیتوں کا اندازہ کیا اور اس کے اچھے اثرات محسوس کئے۔ اس پروگرام میں کل پانچ مقابلے تھے جس میں تقریباً چالیس طلبہ نے حصہ لیا۔ اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو انعامات دیئے گئے۔ مزید برآں ہر حصہ لینے والے طالب علم کو تشجیعی انعام سے نوازا گیا۔ پروگرام کے اختتام پر صدر پروگرام اور رکن مجلس انتظامیہ جامعۃ الفلاح مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے ہاتھوں انعامات تقسیم ہوئے۔

انعام یافتہ طلبہ کی فہرست :۔

قرأت میں: محمد نعمان درجہ حفظ I، توحید احمد درجہ حفظ II اور قیام الدین عربی چہارم III۔ اعلیٰ درجات کے تقریری مقابلہ میں قیام الدین عربی چہارم I، محمد شاہد عربی دوم II اور اظہر نسیم عربی سوم III۔ ثانوی درجات کے تقریری مقابلہ میں محمد آصف درجہ ہشتم I، محمد اظفر درجہ ہفتم II اور عبداللہ درجہ ہفتم III؛ مضمون نویسی میں عطاء الرحمن عربی سوم I، محمد شاہد اسلمی عربی دوم II اور ضیاء الرحمن عربی اول III۔

عام معلوماتی مقابلہ میں گروپ اے I (شرکاء۔ قیام الدین، جاوید احمد، ضمیر احمد، اظہر نسیم، محمد شاہد) اور گروپ بی II (شرکاء: ابوطلحہ، عطاء الرحمن، عالمگیر، وسیم احمد، تبریز احمد) نظم خوانی کے مقابلہ میں قیام الدین عربی چہارم I، محمد نعمان درجہ حفظ II، اور محمد آصف درجہ ہفتم III۔

کلیۃ البنات

کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح میں اب تک کوئی دفتر نہیں تھا جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اب

باقاعدہ وہاں ایک دفتر قائم کر دیا گیا ہے جہاں اخلاق احمد صاحب دفتر انچارج کی حیثیت سے رہتے ہیں اور باہر کی دیگر ضروریات کی تکمیل کے لئے چوبیس گھنٹے جناب عرفان شاہ صاحب کا قیام رہتا ہے۔ جامعۃ الفلاح کے ایک بزرگ استاد جناب مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کو کلیۃ البنات کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے مزید بہتری آئے گی۔

انجمن کی سرگرمیاں

"میں آپ سے بہت دور ہوں لیکن آنے جانے والوں اور "حیاتِ نو" کے ذریعہ آپ کی سرگرمیوں کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ یوں تو کم و بیش سبھی مدرسوں میں طلبۂ قدیم کی انجمنیں قائم ہیں لیکن بیشتر برائے نام کی ہیں۔ مدرسے کے کسی بڑے جلسے کے وقت آنے والے طلبہ مل بیٹھتے ہیں اور پھر اپنے اپنے مقام پر چلے جاتے ہیں۔ کوئی مستقل پروگرام نہیں چلتا لیکن الحمد للہ آپ کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ میری معلومات کی حد تک آپ کی انجمن طلبہ شاید واحد انجمن ہے جو مستقل پروگرام رکھتی ہے، مادرِ علمی سے قلبی تعلق رکھتی ہے۔ وہاں کے ذمہ داروں کے خلاف محاذ بنانے کے بجائے تعاون کرتی ہے، اپنے پیش رو اور پس رو ساتھیوں کی خبر گیری کرتی اور ممکن تعاون کرتی ہے۔ یہ میرے جیسے لئے نہیں ہر اس شخص کے لئے جو جامعہ سے قلبی لگاؤ رکھتا ہے انتہائی خوشی کی بات ہے۔ آپ کی انجمن ایک فعال، متحرک اور سرگرم انجمن ہے......"

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کے سلسلے میں یہ تھے وہ احساسات جن کا اظہار جامعہ کے ایک سابق استاد مولانا محمد شہباز صاحب اصلاحی نے اپنے ایک خط میں کیا تھا۔ واقعی انجمن کے سامنے ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کے مطابق اس کے افراد وسائل کی کمی کے باوجود سرگرمِ عمل ہیں۔

شوریٰ

۲۸ اور ۲۹ مارچ ۱۹۸۹ء کو انجمن کی شوریٰ کا حسب معمول سالانہ اجلاس ہوا جس میں گزشتہ سرگرمیوں کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل تجویز کیا۔ اس کی مختصر روداد سکریٹری انجمن کے قلم سے آپ اس شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

جائزہ

سکریٹری انجمن جاوید اشرف صاحب فلاحی نے جمعیۃ طالبات جامعۃ الفلاح کو انجمن

کی طرف سے ایک آہنی الماری ہدیہ کی، واضح رہے کہ اس سے پہلے انجمن کی کوششوں سے وہاں لائبریری کا باقاعدہ نظم ہو چکا ہے۔

استقبالیہ

"ہر انسان کے پاس خدا کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت ہے۔ ضمیر کی قوت اور ضمیر کی آواز، اس کو کچل دینا اور دبا دینا یہ آسان کام نہیں ہے اس کے لئے قربانیاں دینی ہوں گی۔ یاد رکھو جو ضمیر بیچ دیتا ہے وہ زندہ دل انسان نہیں ہے۔ ضمیر کے خلاف حرکت جھوٹ بھی ہے اور خودکشی بھی۔ حق گوئی و بے باکی ضمیر کی آواز کے [illegible] عمل ہی کا نام ہے۔"

ان خیالات کا اظہار ۲۸ مارچ ۸۹ء کو انجمن کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیہ میں سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جاوید اشرف فلاحی کے افتتاحی کلمات کے بعد رکن شوریٰ برادر اسماعیل احمد فلاحی نے فارغ ہونے والے طلبہ کا استقبال کرتے ہوئے کیا۔ برادر [illegible] نے کہا: "ہماری انجمن کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ جامعہ سے جانے کے بعد ہم [illegible] ہماری صلاحیتیں، ہمارے جذبات سب اظہارِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ [illegible] سے جا ملیں۔ اس بات کا اظہار اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہم نے بارہا [illegible] میں کیا ہے۔ دنیا کے جھمیلوں میں الجھ کر ہم اس مقصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ شیطان ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے اس کے شر سے ہم بھی محفوظ نہیں۔ عزیزو! اس مقصد سے غافل نہ رہنا اور خدائے مقلب القلوب سے استحضارِ قلب کے ساتھ توفیق مانگتے رہنا کہ وہ [illegible] سے محفوظ رکھے۔ توفیق اسی سے ملے گی، جرأت وہی دے گا، حوصلہ وہی عطا کرے گا اور [illegible] وہی مدد کرے گا۔"

اس موقع پر استاذ گرامی اور رکن شوریٰ مولانا رحمت الٰہی صاحب فلاحی نے انجمن کی اہمیت و ضرورت اور اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: "آپ اپنی انجمن کو طلبۂ قدیم [illegible] (OLD STUDENTS) کی دوسری انجمنوں کی طرح نہ سمجھیں۔ یہ اس طرح کی کوئی انجمن نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں لیکن پھر بھی انجمن نے وسائل کی کمی کے باوجود [illegible] وہ حوصلہ افزا ہے۔ انجمن ایک اجتماعیت کا نام ہے۔ اجتماعیت میں [illegible]

مختلف صلاحیتوں کے افراد ہوتے ہیں۔ اجتماعیت سے جڑ کر رہنا اور اس کے افراد کو لے کر چلنا گویا ایسا ہی ہے جیسے ایک کلو زندہ مینڈکوں کو ترازو میں تول لینا۔ آپ انجمن اور اس کے افراد میں فرق کیجئے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہم انسان ہیں۔ ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں۔ ایک جگہ رہنے سے طرح طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں، اگر ابھی تک کوئی حجاب حائل تھا تو اسے ختم ہونا چاہئے۔ ہمارے طریقہ کار میں اور خود ہمارے اندر جو خامیاں پائی جاتی ہیں، انھیں ہم سب مل کر دور کریں گے۔

نور محمد صاحب فلاحی رکن شوریٰ نے اس بات پر زور دیا کہ آپ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہوں تحریک اسلامی سے ضرور ربط رکھیں، اس سے حوصلہ ملے گا، اجتماعیت کی برکتیں کسی سے مخفی نہیں۔ ولی اللہ سعیدی فلاحی صاحب نے نماز کا اہتمام کرنے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا لوگ کسی فلاحی کو دیکھتے ہیں تو اس کے لئے ان کے اندر پیار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو فراموش نہ کریں۔

حاضرین کی خواہش پر مولانا محمد عمران صاحب فلاحی رکن شوریٰ اٹھے اور کہا یہی جگہ ہے جہاں آپ کو جامعہ نے الوداع دیا تھا۔ شاید ہی کوئی استاد ایسا رہا ہو جس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے ہوں۔ آج اسی جگہ پر انجمن کی طرف سے ہم آپ کا استقبال کر رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ایک تازہ کمک مل رہی ہے۔ ہمارے یہ بھائی ہمارا ساتھ دیں گے۔ مولانا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کوئی باپ اپنے بیٹے اور کوئی استاد اپنے شاگرد کو کہتر اور کمتر نہیں دیکھنا چاہتا۔ کوئی باپ یا کوئی استاد ایسا نہیں چاہے گا کہ میرا لڑکا یا میرا شاگرد مجھ سے کم علم ہو۔ دوسروں کے درمیان حسد ہو سکتا ہے لیکن استاد اور باپ حسد نہیں کرتے۔ دونوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد یا ان کا شاگرد زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔ آپ میں ایسے طلبہ ہو سکتے ہیں جن کے سلسلہ میں دانستہ یا نادانستہ زیادتی ہو گئی ہو۔ آپ مجھے معاف کر دیں یا بدلہ لے لیں میرا اپنا خیال ہے اور میں اپنے طور پر سوچتا ہوں کہ اگر کبھی کسی کی گوشمالی کی ہے یا ڈانٹا ہے یا کوئی اور سزا دی ہے تو اپنا فرض سمجھ کر ایسا کیا ہے اور آپ کے فائدے کے لئے کیا ہے اس سنار کی طرح جو بھٹی میں سونا ڈالنے کے بعد اس پر ہتھوڑے بھی چلاتا ہے۔

تھا، فارغین کی نمائندگی برادر عبید الرحمٰن فلاحی نے کی۔ انھوں نے کہا ابھی تک ہم آپ کے زیر سایہ رہے ہیں۔ دوسروں کے بالمقابل آپ ہم سے قریب تر ہیں۔ میں اپنی طرف سے اور اپنے تمام ساتھیوں کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم سب آپ کے مشوروں کو سامنے رکھیں گے اور اقامتِ دین ہمارا نصب العین ہوگا۔

اس سال فارغ ہونے والے طلبہ کے نام یہ ہیں:

رضوان الحق، گورکھپور۔ سعید احمد عامر، احمد آباد۔ فیروز عالم، نیپال۔ اویس احمد، نیپال۔ محمد سعد، نیپال۔ شمشاد عالم، سیوان۔ امیر الحسن، بدایوں۔ ابو الکلام [illegible] عبد الاول، بستی۔ عبید الرحمٰن، بستی۔

دعائے صحت

استاذ جامعۃ الفلاح مولانا محبوب عالم صاحب فلاحی کی صحت ایک عرصہ سے ٹھیک نہیں چل رہی ہے ادھر چند ماہ سے مرض کی شدت [illegible] ہے۔ تقریباً صاحب فراش ہیں، اٹھنا بیٹھنا مشکل ہے۔ فلاحی برادران سے خاص طور [illegible] سے عام طور سے امید کی جاتی ہے کہ وہ موصوف کی صحت کے لئے دعا کریں گے۔

وفیات

ہمارے قارئین افسوس کے ساتھ یہ خبر سنیں گے کہ برادر رضوان الحق [illegible] (گورکھپور) کے بڑے بھائی افضال الحق صدیقی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کر چکے تھے۔ ہاؤس جاب (HOUSE JAB) کر رہے تھے۔ [illegible] کے ساتھ ایک مقام پر گئے ہوئے تھے، راستہ میں ایک نہر میں غسل کرنے [illegible] ۹۵ء کو ڈوب گئے۔ کئی روز کے بعد لاش برآمد ہو سکی۔ موصوف نماز کے عادی [illegible] کم سخن اور اخلاق و کردار سے مزین تھے۔ قرآن سے خصوصی لگاؤ تھا اور [illegible] نمایاں رہی ہیں۔

ہم دکھ کے ساتھ یہ خبر بھی دیتے ہیں کہ برادر عبد الباری فلاحی (بستوی) کے چچا جناب ملک علی اللہ صاحب بھی ۱۰ر اپریل ۹۵ء کو باسٹھ سال کی عمر میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ جون ۱۹۸۷ء میں پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے۔ محمود ریا گنج، بستی کے سرگرم ارکان میں

شمار ہوتا تھا۔ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

ہم نے رنج و غم کے ساتھ یہ خبر بھی سنی کہ استاذ جامعہ ماسٹر قاضی زین العابدین صاحب کے خسر الحاج میر غلام احمد حسن صاحب ترانوے برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم مہاراشٹر کے ضلع امراوتی کے رہنے والے تھے۔ موصوف کئی بار جماعت اسلامی کی مرکزی نمائندگان و حلقہ مہاراشٹر کی شوریٰ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ ریاست برار کی تعلیمی و ملی سرگرمیوں میں موصوف کا نمایاں رول رہا ہے۔

ادارۂ "حیات نو" کو ان حادثات پر گہرا دکھ ہے۔ ادارہ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ ان کے گناہوں کو بخش دے۔ پسماندگان کو صبر کی توفیق اور ان کا بہترین بدل عطا فرمائے۔

مولانا قرآن ماں صاحب اصلاحی اعظم گڑھ کے ایک عالم دین تھے۔ عرصہ تک مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں استاد رہے ہیں۔ اپنے علاقہ میں ہردلعزیز تھے۔ ان کی جانب عزت واحترام کی نگاہیں اٹھتی تھیں۔ ہمارے جامعہ کے بیشتر بزرگ استادوں کے استاذ رہ چکے ہیں۔ ۱۵ر مئی ۱۹۸۹ء کی دوپہر میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جامعہ سے اساتذہ و طلبہ کی ایک بڑی تعداد نماز جنازہ میں شرکت کے لئے مولانا کے گھر چاند پٹی پہنچی۔ صدر جامعہ اور سکریٹری انجمن نے اس پر اپنے گہرے رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کے لئے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا مانگی۔

صدر جامعہ کل ہند دینی تعلیمی کنونشن میں

کم سے کم اجرت کے قانون کے نفاذ کی وجہ سے مدارس اسلامیہ کے لئے جو خطرہ کی گھنٹی بج رہی تھی اس پر اور اسی طرح کے دیگر تعلیمی مسائل پر غور و فکر کے لئے دینی تعلیمی کونسل اترپردیش نے مدارس کے ذمہ داروں کو ملک گیر پیمانے پر آواز دی تھی جس کے نتیجہ میں مدارس کے ذمہ داروں کا ایک نمائندہ اجتماع یکم و ۲ر جون ۱۹۸۹ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کی اہمیت کے پیش نظر صدر جامعہ نے ندیم الفرصتی اور عدیم الفرصتی کے باوجود وقت نکالا اور اس اجلاس میں شرکت کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

پہنچے۔ راقم بھی اس سفر میں ساتھ تھا۔ اللہ کا فضل ہے کہ ریاستی حکومت نے کم سے کم اجرت کے قانون (MINIMUM WAGES) کے دائرۂ اثر سے مدارس کو مستثنیٰ کرنے کے لئے ایک نوٹیفکیشن جاری کر دیا ہے۔

اس کانفرنس کا بہت پہلے اعلان کیا جا چکا تھا، اس کا پروگرام بھی طے کیا گیا تھا اور اس کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں کہ چند روز پہلے اچانک ایک حلقہ کی طرف سے اسی مقصد کے لئے دوسری کانفرنس کا اعلان ہو گیا اور ملت کے دیگر حلقوں اور اداروں کی نمائندگی کے بغیر یہ کانفرنس ۲۷ر مئی ۸۹ء کو ہو گئی۔ اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے یکم و ۲ر جون کو ہونے والی کانفرنس کہیں ناکام نہ ہو جائے لیکن اللہ کا فضل رہا یہ کانفرنس وقت پر ہوئی۔ ملت کے عام اداروں اور مکاتب فکر کی اس میں نمائندگی ہوئی اور یہ توقع سے زیادہ کامیاب رہی۔ عام طور سے یہ احساس پایا جاتا تھا کہ اس طرح کے ملی مسائل میں ملت کے عام حلقوں کو نظر انداز کر دینا ملت کے ساتھ وفاداری نہیں ہے۔

سالانہ امتحان کے ممتاز طلبہ

۱۹۸۸-۸۹ء کے سالانہ امتحان میں درج ذیل طلبہ و طالبات نے اپنے درجات میں نمایاں کامیابی حاصل کی: عربی ہفتم: عبید الرحمٰن I، رضوان الحق II، عبدالاول III۔ عربی ششم: محمد ضیاء الحق I، ضیاء الرحمٰن II، خالد حسن رشید III۔ عربی پنجم: محی الدین I، محمد یٰسین II، حفظ الرحمٰن III۔ عربی چہارم: جاوید سلطان I، ذوالفقار اکرامی II، وسیم ملک III۔ عربی سوم: عارف حسین I، شہزاد ظفر II، افضال احمد III۔ عربی دوم: صداقت حسین I، حسام الدین II، عبدالعلیم III، عربی اول: سراج الدین I، حمید اللہ II، اسعد ادریس III۔

ہشتم ثانوی: عبدالحسیب I، ابوزید II، جلال الدین III،

ہفتم ثانوی: افضال الرحمٰن I، ابوصالح II، محمد فرحان اعظمی۔

ششم ثانوی: ریاض الدین I، منہاج الدین II، محمد یعقوب III۔

پنجم ابتدائی: محمد واثق I، محمد عرفان II، محمد تبسال III۔

چہارم ابتدائی: عبدالحی محمد الاثری I، سراج الحق II، شفیق احمد III۔

سوم ابتدائی: بلال احمد I ، امتیاز احمد II ، پرویز احمد III ۔

دوم ابتدائی: ماہتاب عالم I ، صادق احمد II ، امیر فیصل III ۔

اول ابتدائی: علی کوثر محمد عیسیٰ I ، محمد انور II ، ابو حمزہ III ۔

فاضلہ اخریٰ: صالحہ بانو I ، سلمیٰ خورشید II ، ریحانہ بانو III ۔

فاضلہ اولیٰ: افتخارہ وافیہ I ، خورشید جبیں II ، انجم آرا III ۔

عالمہ چہارم: عارفہ I ، لطیفہ II ، نکہت جہاں III ۔

عالمہ سوم: راشدہ محسن I ، صفیہ کوثر II ، عفت جہاں III ۔

عالمہ دوم: کنیز فاطمہ I ، مسرورہ II ، حمیدہ سبحانی III ۔

عالمہ اول: سلمیٰ سلامت اللہ I ، ثمینہ شاہ نواز II ، نور جہاں III ۔

ہفتم ثانوی: شمس زیبا I ، نازش II ، تسنیم کوثر III ۔

ششم ثانوی: خالدہ کمال I ، زینت جہاں II ، شاہدہ قریشی III ۔

پنجم ابتدائی: ناصرہ ریاض الحق I ، نسیمہ مظہر II ، بلقیس III ۔

چہارم ابتدائی: سلطانہ سہراب I ، رخشندہ امان اللہ II ، تسنیم شاہ عالم III ۔

سوم ابتدائی: نفیرہ ابو لیش ، صبیحہ سلامت اللہ ، نائلہ کوثر II I ۔

گل شہلا II ، دل جہاں محفوظ III ۔

دوم ابتدائی: صدیقہ I ، عائشہ محسن II ، تبسم مسرور III ۔

اول ابتدائی: معاشرہ ذوالفقار I ، زاہدہ بانو عبداللطیف II ، معاویہ خاتون عبدالحکیم III